غنچۂ تبسم

نگارش

تمکین کاظمی

طبع اوّل ۱۹۴۵ء ایک ہزار

قیمت عاؔ دو روپیہ

ملنے کے پتے

۱ مکتبۂ ابراہیمیہ (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔
۲ مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ - قرول باغ، } دہلی
۳ مہتمم رسالہ "ساقی" کھاری باؤلی، } دہلی
۴ حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لیمیٹڈ، } دہلی
۵ صدیق بک ڈپو، } لکھنؤ
۶ نسیم بک ڈپو، } لکھنؤ
۷ کتابستان، ۱۷، سیلی روڈ، الہ آباد،
۸ اردو بک ڈپو، بچھراؤں (مراد آباد) یوپی،
۹ حالی بک ڈپو، پانی پت،
۱۰ شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور،



مولانا تجلی مرحوم

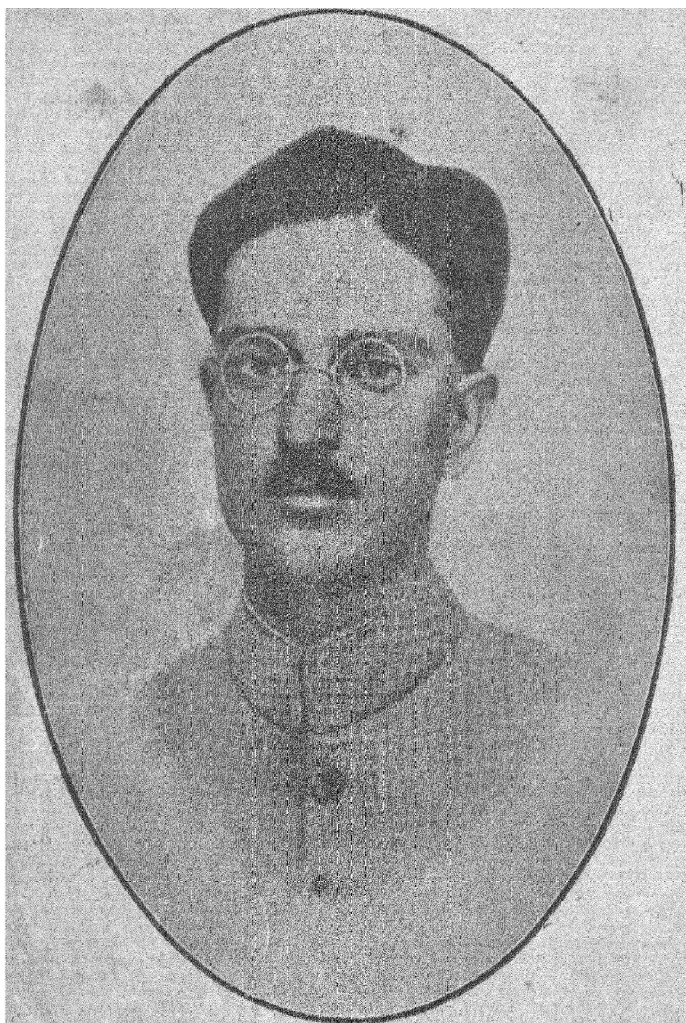
ولادت
ربیع الثانی سنہ ۱۲۹۲ ہجری - حیدرآباد دکن

وفات
۱۰ صفر سنہ ۱۳۲۶ ہجری - گلبرگہ شریف

بروحِ پاکِ والدِ مرحوم

مولٰنا تجلّی

تقدیم گردید



سید تمکین کاظمی

سرِآغاز

بنام خداوند بخشایش گر مہرباں

حکایات اور مزاحیات میرے موضوع سے بہت دور تھے کیونکہ میں اکثر تاریخی
اور علمی مضامین پر زیادہ وقت صرف کیا کرتا تھا۔ ابتداءً میں نے تفریحی طور پر اس قسم کے
مضامین لکھنا شروع کیا چنانچہ "زن مرید" اسی سلسلہ کی پہلی قسط ہے جس کی اشاعت
رسالہ نظر لکھنؤ جولائی ۱۹۲۷ء میں ہوئی مگر چند ہی مضامین لکھ کر میں نے اسے ختم کر دیا
چنانچہ ۱۹۲۹ء میں سوائے ایک "گھبراہٹ" کے اور کوئی مضمون نہیں لکھا۔ مگر ۱۹۳۰ء
اور اوائل ۱۹۳۱ء میں مجھے مصروف زیادہ رہنا پڑا اور مدیران رسائل نے مضامین کیلئے
مارے تقاضوں کے ناک میں دم کر دیا۔ ہر ایک رسالہ کے لئے علمی، ادبی، یا تحقیقی مضمون
لکھنے کا وقت کہاں سے لاتا بعضوں کے لیے کچھ وقت نکال لیا اور بعضوں کو انہیں
"بدحواسیوں" پر ٹرخا دیا۔ یہ ہے شانِ نزول ان مضامین کی جو کتابی صورت میں آپ کے
سامنے ہیں، ان میں سے اکثر مضامین میرے نام سے شائع ہوئے ہیں اور بعض فرضی
ناموں "نجاری" "آوارہ" "فلک نما" وغیرہ کے ساتھ چھپے ہیں۔

بعض مضامین کی زبان پر اکثر احباب کو اعتراض ہوگا کیونکہ اکثر جگہ میں نے عمداً دکنی زبان اور محاورہ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور خصوصاً ان مضامین میں زیادہ کوشش کی گئی ہے جو حیدرآباد کے رسائل میں طبع ہوے ہیں یا جن مضامین میں حیدرآباد کی تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خوش نصیبی سے مجھے دکنی ہونے کا فخر ہے اسی لئے میں دکنی اردو لکھتا ہوں

ترا ملک دکھن تو دکھنیچ[1] بول
تجھے کیا پرائی تو اپنیچ[2] بول

میری مادری زبان اردو ہے اور میں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے مگر میں اس قدر مجبور ہونا پسند نہیں کرتا کہ "اماحوا" کی بجائے "ماماحوا" "گنڈیوں" کے عوض "گھنڈیاں" "چھاتے" کی بجائے "سینہ" "گرد ڈاڑھی" کے بدلے "گردے کی ڈاڑھی" اور "پچکے ہوے گال" کو "پیچکے ہوے گال" کہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ برادرانِ ہند گرد ڈاڑھی پڑھ کر گردے کی ڈاڑھی کا تصور کرنے میں تامل کریں گے اور "چھاتے" سے "سینہ" مراد نہ لیں گے مگر میں نے جان بوجھ کر ان الفاظ کا استعمال کیا ہے تاکہ وہ دکنی الفاظ جو آہستہ آہستہ غائب ہو رہے ہیں کم از کم میرے مضامین میں محفوظ رہ جائیں اور برادرانِ ہند بھی اِن دکنی الفاظ سے واقف ہو جائیں۔

علاوہ ازیں بعض دکنی مصطلحات "لنگر" "جھمکڑے" "تفصیر" "تنبی" وغیرہ بھی ان مضامین میں جابجا آگئے ہیں جو برادرانِ ہند کے لئے کیسر نئے ہیں بعض احباب کا

---

[1] دکھنی ہی ۱۲ [2] اپنی ہی ۱۲

خیال تھا کہ آخر میں ایک فرہنگ لگائی جائے مگر میں اس بد ذوقی کا مخالف ہوں جنھیں ضرورت ہوگی وہ کسی حیدرآبادی سے پوچھ لینگے یا مجھ سے دریافت کرلینگے۔

ان دکنی الفاظ اور مصطلحات کے بجائے میں چاہتا تو ٹھیٹھ یوپی کے محاورات استعمال کرسکتا تھا مگر جس طرح حضرت نیاز فتحپوری نے تحریر فرمایا ہے کہ ان کی سماعت سوا ان محاورات یا اصطلاحات کے جو گہوارے سے ان کے کانوں میں پڑے ہیں مخالف آواز سن کر مشوش ہوتی ہے۔ اسی طرح میری زبان بھی ان محاورات اور اصطلاحات کو ادا کرتے ہوئے مشوش ہوجاتی ہے جو گہوارے سے میرے کانوں میں نہیں پڑے چونکہ دلی والے اپنے محاورات اور اصطلاحات بے تحاشا استعمال کئے جاتے ہیں اور لکھنؤ والے ان پر معترض نہیں ہوتے اور لکھنؤ والے بے دھڑک اپنی زبان بولتے اور لکھتے ہیں اور کوئی انہیں پوچھتا نہیں اسی طرح حیدرآباد والوں کو بھی اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہئے نہ تو دلی والوں کو اس پر اعتراض کا حق ہے اور نہ لکھنؤ والوں کو۔ اس مجموعہ میں کتابت اور طباعت کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں، جب تک ہندوستان میں ٹیتھو پریس رہیگا اس وقت تک یہ غلطیاں مستقل طور پر موجود رہینگی ایک میں ہی کیا سارا ہندوستان ان چھاپے کے پتھروں سے "دق" ہے

تاہم "شمس الاسلام پریس" کے کارپردازوں کا مشکور ہوں کہ حتی الامکان روا داری اور تن دہی سے طباعت کا کام ختم کیا گیا مگر مجھے کتابت کے لئے سخت کوفت اٹھانی پڑی کیونکہ بدنصیبی سے عبدالکریم جیسے کاتب کا کام جو زود نویس اور حیدرآباد کے اچھے کاتبوں میں

شمار ہوتے ہیں مگر حد درجہ غلط نویس اور بے انتہا غیر پابند نہایت کم سواد ہیں جنہوں نے املے کی غلطیوں کے علاوہ جملوں کے جملے چھوڑ دئیے اور مجھے جا بجا انہیں غلط ساط الفاظ کو الٹ پلٹ کر چھپوانا پڑا۔

"اعلام" "تاثر" "تعارف" اور "تقریب" کے لئے مکرمی مولانا نیاز فتحپوری مدیر رسالہ "نگار" لکھنؤ" محترمی مولانا احسن مارہروی لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج علیگڈھ" مجبی حضرت ملا رموزی (بھوپال) اور عزیزی مولوی عبدالمنعم سعیدی (گلبرگہ) کا رہین منت ہوں کہ باوجود اپنی مصروفیتوں کے ان حضرات نے "غنچۂ تبسم" کے لئے کچھ نہ کچھ لکھا۔ "صحت نامہ" کی ترتیب کے لئے محترمی مولوی محمد سردار علی صاحب مدیر رسالہ "تجلی" کا مشکور ہوں کہ آپ نے صحت نامہ مرتب فرما دیا اگر ان غلطیوں کے علاوہ اور کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں تو اسے مولوی صاحب کی بشریت پر محمول فرمائے۔

والد مرحوم کی اور اپنی تصویر کے بلاک کے لئے برادر مکرم مولوی شاہد احمد بی اے (آنرز) مدیر رسالہ "ساقی" دہلی کا منت پذیر ہوں کہ موصوف نے خاص طور پر دونوں بلاک بنوا کر روانہ فرمائے۔

مشفقی مولوی عبدالحق صاحب مہتمم مکتبۂ ابراہیمیہ (محدود) حیدرآباد دکن کا شکریہ ادا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ انہیں کی وجہ اس مجموعے کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے ہی مجبور کر کے اس کی طباعت کے لئے آمادہ کیا فقط

تمکین کاظمی

ملک پیٹھ۔ حیدرآباد دکن
۱۔ جون ۱۹۳۱ء

اعلان

از

مولانا نیاز فتحپوری مدیر رسالہ نگار (لکھنؤ)

غنچۂ تبسم جناب تمکین کاظمی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو "فکاہات" کے سلسلہ میں انہوں نے لکھے ہیں۔ چونکہ میں "طنزیات" اور "مزاحیات" دونوں کو "فکاہات" میں شامل کرتا ہوں، اسلئے میرا مقصود یہ ہے کہ دو رنگ کے مضامین اس مجموعہ میں نظر آتے ہیں۔

اس وقت یورپ کا کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں ہے جس میں یہ مخصوص طرزِ تحریر مقبول نہ ہو۔ خصوصیت کے ساتھ تنقید کہ اسکی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں ظرافت کا گہرا رنگ شامل نہ ہو ہندوستان میں اس انداز کے لکھنے والے چند ہیں۔ جناب تمکین کاظمی نے حال ہی میں اس رنگ کو اختیار کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ اکتشاف ابھی ہوا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

اس مجموعہ کے تمام مضامین صحیح معنی میں "تنقید وکاہی" کی حیثیت رکھتے ہیں اور چونکہ وہ یکسر مقامی حالات مقامی تشخصات یا حیدرآباد کی اصطلاح میں "ملکی" افراد و مناظر سے متعلق ہیں اس لئے انکا پورا لطف اٹھانا کسی غیر شخص کیلئے دشوار ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر اس خصوصیت سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی انکو دیکھا جائے تو ان کے پڑھنے اور ختم کرنے پر بڑی حد تک انسان مجبور ہو جاتا ہے خواہ وہ واقعات و تلمیحات سے بیگانہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں صحیح فیصلہ نہیں کرسکتا کہ موجودہ حیدرآباد "دورِ نہضت و ارتقاء" سے گذر رہا ہے یا "دورِ انحطاط" سے لیکن ان مضامین کے دیکھنے کے بعد میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ ضرور کسی ایسے زمانہ سے گزر رہا ہے جو پہلے سے مختلف اور بہت مختلف ہے۔ جناب تمکین کاظمی کے اکثر مضامین اسی حقیقت کے مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ نتیجہ کے لحاظ سے وہ حیدرآباد حالیہ کو ترجیح دیتے ہیں یا دور ماضی کے سوگواروں میں ہیں وکاہی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ جذبات کہلاتی ہے۔ سو ان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔

زبان کے لحاظ سے البتہ مجھے اکثر جگہ اختلاف ہے لیکن ظاہر ہے کہ

یہ اختلاف شمال وجنوب کا اختلاف ہے جس کا دور ہونا ممکن نہیں اور نہ اس پر زیادہ اعتناء کی ضرورت ہے۔ اکبر مرحوم کی ایک صحبت میں زبان وصحت زبان کا ذکر تھا انہوں نے کیا خوب بات کہی کہ اگر کوئی بنگالی "ہاتھی آئی" کہتا ہے تو ہنسنے کی ضرورت نہیں، یہ دیکھو کہ اسکا مدعا تمہاری سمجھ میں آگیا یا نہیں۔ کیونکہ زبان کا مقصود یہی ہے۔ میں بڑی حد تک اس کا موافق ہوں لیکن اس کا کیا علاج کہ جو محاورے یا اصطلاحات گھوارہ سے کانوں میں پڑے ہیں۔ انکے خلاف اگر کوئی آواز آجاتی ہے تو تھوڑی دیر کیلئے سماعت مُشَوَّش ہوجاتی ہے۔

مجھے مسرت ہے کہ میرے قیام حیدر آباد کے دوران میں اس مجموعہ کے کچھ اجزاء جناب تمکین کاظمی نے مجھے مطالعہ کیلئے مرحمت فرمائے اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں مجھے اس خیال کے اظہار کا موقع ملا فقط

نیاز فتحپوری

حیدرآباد دکن
۱۴۔ اپریل ۱۹۳۱ء

تاشُّ

از

مولانا احسن مارہروی پروفیسر ادبیاتِ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

کہنے کو ہمارے منہ میں زباں ایک ہی، مگر بولتے وقت لب و دہن کی مختلف حرکات کی وجہ سے اس یکرنگ کی نیرنگیاں عجیب عجیب انداز دکھاتی ہیں۔ آپ کسی ایک لفظ کو لے لیجئے اور بولتے وقت اسی ایک لفظ کا لب و لہجہ بدلتے جائیے، پھر دیکھئے کہ ایک لفظ اپنے ہر رد و بدل میں کیا کیا مفہوم پیدا کرتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ چُپ بمعنی خاموشی یا خاموش عام بول چال میں ہے۔ اب اس کے مفہومکی تعداد گنئے۔

(۱) تحکمانہ لہجے میں (بصیغۂ امر)

(۲) پیار کے انداز میں (بآواز نرم)

(۳) رازداری کا پہلو لئے ہوئے (آہستہ سے)

(۴) حیدرآبادی مفہوم میں بمعنی گزراں (تینہیں)

ان مطالب کے سوا اور معنوی پہلو بھی اس لفظ میں حسبِ موقع نظر آتے ہیں جنکی تفصیل غیر ضروری سمجھی گئی۔ عام اردو جاننے والے خود سمجھ لیں گے۔ غرض یہ ہے کہ ہر زبان اپنے مراتب ترتیب میں مختلف نوعیتیں رکھتی ہے اور اسکی تدریجی حالت عام تصنیف و تالیف، سیاسی لکچر مذہبی مواعظ اور روزمرہ بات چیت میں ایک دوسرے سے جداگانہ نظر آتی ہے۔ ان سب تنوعات کے بعد تقریر و تحریر کی متانت و ظرافت ایک نوعیت خاص ظاہر کرتی ہے جو ہر ادبی زبان میں تفنن طبع کیلئے ضروری اور جزو لاینفک ہے۔

اسالیب بیان کے یہ تغیرات فطری اور وہبی ہیں ان سے اختلاف کرنا گویا قدرت سے روگرداں ہونا ہے۔ جس طرح تلفظ کے انداز و ادا میں اختلاف ہے۔ اس طرح ہر متین اور ظریف مضمونکے بھی مراتب مدارج مختلف ہوا کرتے ہیں۔ خشک بیانی۔ بے کیف سخن آرائی نامربوط اور اجنبی زبان سنجیدہ مضامین کیلئے غیر دلچسپ ہے اور فحش یا عریاں مذاق بذلہ سنجی کے منافی۔ ہر مقرر و محرر کا فرض اولین ہے کہ جس بحث پر تقریر یا تحریر کی جائے اُن خصوصیات کا لحاظ رکھا جائے جن سے ادبِ عالیہ کی توقیر ہوتی ہو نہ کہ توہین۔

غنچۂ تبسم جسکا نام بتا رہا ہے کہ یہ غنیۃ المصلی یا ازالۃ الاوھام

جیسی کتابوں میں شامل نہیں ہے بلکہ تفنّنِ طبع اور انشراحِ قلب کی دلچسپیاں بڑھانے کے لئے تالیف کیگئی ہے اس کا مذاق بیہودگی اس کا اندازِ بیان بدتمیزی سے دست و گریباں نہیں بلکہ الھزل فی الکلام کالملح فی الطعام کا مصداق ہے جس کے مصنف جناب تمکین الکاظمی ہیں۔ اپنی نسبتِ اسمی کے لحاظ سے تو ان عزیز کو جبلِ ابو قبیس یا کم از کم اپنے ملک کے ایلورا غاروں[1] کی بابت کوئی مستحکم اور منجمد کتاب لکھنی چاہئے تھی تاکہ انکی تمکنت مسلم الثبوت ہو جاتی لیکن اس طرح عمل پیرا ہونے میں انہیں اپنی ایک خلقی اور پیدائشی خصلت سے اعراض کر کے کفرانِ نعمت کا الزام اپنے سر لینا پڑتا۔

بہر حال میں نہایت مسرت سے انکی بذلہ سنجیوں کی داد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ انکی نثر کو بھی لسان العصر اکبر مرحوم کی نظم کے برابر مقبولیت نصیب ہو۔

ہندوستان کے اکثر کثیر الاشاعت جرائد و رسائل میں ابتک ان کے جو مزاحیہ مضامین شائع ہوتے رہے ہیں ان سب کو یکجا

---

[1] حضرت! چند روز انتظار فرمائیے۔ "غارہائے ایلورا" سے متعلق ایک کتاب تیار ہے جو عنقریب طبع ہوگی (تمکین)

کر دیا گیا ہے جن کی مختصر مگر جامع تعریف یہ ہے کہ ؎

ہی غنچۂ تبسّم تمکینِ کاظمی
ایسا مذاق جس میں متانت ہی لازمی

احسن مارہروی

انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

۱۲ اپریل سنہ ۱۹۳۱ء

تعارف

از

ضیاء الملک حضرت مُلّا رموزی، فاضل الٰہیات، ایم آر، اے، ایس، (لنڈن)

یم، ال، ایس، (امریکہ)

اگر کنوئیں کے برابر گہری اور تالاب کے برابر چوڑی نظر سے دیکھا جائے تو زبان اُردو اور ادبیات اردو کیلئے یہ زمانہ وہ اللہ بخشی میر امّن دہلوی اور میر انیس لکھنوی کے زمانہ سے اسلئے کہیں اچھا ہے کہ اس زمانہ میں لکھائی چھپائی اور "لادنے" اور "لیجانے" کے ذرائع کافی ہیں اور انہی چیزوں سے روپیہ کمانے کی خاطر چند تجارت پیشہ لوگوں نے اردو میں جو رنگین اور چمکدار اور اونچے پورے اخبارات اور رسالے جاری کئے تو نام یہ ہوا کہ "اردو خاصی ترقی کر چکی" حالانکہ اونچی نظر والوں کا خیال ہے یعنی ملا رموزی کا کہ اگر اردو واقعی معنی میں کوئی ٹھوس ترقی کرتی تو سب سے پہلے وہ اپنے پرانے مولوی عبد الحق صاحب کی عزت افزائی کا بت اورنگ آباد میں کبھی کا نصب کر دیا جاتا اسلئے کہ جہاں اب مولوی صاحب ممدوح کے نام کے ساتھ لفظ "انجمن ترقی

اردو" تخلص سابن کر رہ گیا ہے۔ وہاں بھی ایک مولوی صاحب تھے
جنہوں نے بی اے پاس کر کے بھی "ترقی اردو" کی زبردست خدمات
انجام دیں مگر نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہزار روپیہ ماہوار پر "الٹے" ملازم تو رکھ
لئے گئے مگر خدمت ادب و زبان کیلئے آزاد نہ کئے گئے۔ اور مناصب
یا جاگیریں پا رہے ہیں وہ جو پانیر اخبار کے سوا یہ بھی نہیں جانتے کہ ہمارے
والد کی زبان اردو تھی یا انگریزی؟

القصہ جو کچھ بھی ہوا، ہوا لیکن ملّا رموزی کی پسند کی دو چار باتوں
میں سے ایک یہ بات بہت ہی عمدہ ہوئی کہ اِس زمانے میں دو چار
اہل قلم نہایت ہی بہتر پیدا ہو گئے جن میں سے باقی کے نام دل میں
رکھکر صرف حیدر آباد کے بنے ہوئے مولوی تمکین کاظمی صاحب
منشی فاضل، ایم، آر، اے، ایس، کا نام ظاہر کرتے ہیں پس واضح ہو کہ
ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ تمکین صاحب کے اندر مہمان نوازی[1]
کی صلاحیت ہے یا نہیں یا وہ دس بارہ میل پیدل بھی چل سکتے ہیں[2]
یا نہیں وہ شیروانی[3] کیوں پہنتے ہیں اور کوٹ سے کیوں نفرت ہے؟

---

[1] قطعاً صلاحیت نہیں ہے ورنہ ضرور آپ کو حیدر آباد بلاتا۔ [2] بحمد اللہ دس بارہ کیا بیس
پچیس میل چل سکتا ہوں۔ [3] بفضلہ کوٹ پتلون سے نفرت قطعاً نہیں کبھی کبھی اُسے بھی پہنتا ہوں
(تمکین)

وہ موزے پاجامے کے اوپر چڑھا کر پہنتے ہیں[1] یا اندر۔ وہ قمیص کے اوپر والا بٹن کھلا ہوا رکھتے ہیں[2] یا بند۔ وہ بازار سے سودا سلف خود لاتے ہیں یا اُن کا ملازم؟ اگر سودا خود ہی لاتے ہیں تو دوکاندار سے بے قیل و قال سودا خرید لیتے ہیں یا کچھ دیر اس سے یہ بھی کہتے ہیں[3] کہ

ابے مجھے دیتا ہے کہ نہیں؟

ابے اُلّو چلّا تو رہا ہوں کہ ڈھائی آنے کی دیدے ڈھائی آنے کی

بس تو لا دھر دے میرے دام مجھے نہیں لینا تجھ سے!

ہاں ہاں بس ایک تو ہی تو لال سوداگر رہ گیا ہے حیدرآباد میں!

بلکہ ہمیں تو اس سے بحث ہے کہ مولوی تمکین صاحب مضمون نگار ہیں تو کیسے؟ اور ان کے مضامین زبانِ اردو کیلئے کس حد تک مفید و موثر ہیں۔

ان دونوں سوالات کو اگر مولوی سلیمان ندویوں[1] ابو الکلام

---

[1] ایسی بد ذوقی آج تک نہیں کی۔

[2] صرف شدید گرمیوں اور محرم میں [3] افسوس ہے کہ یہ آج تک نہ آیا۔

[4] شکر ہے کہ ایسا موقعہ کبھی نہیں ہوا صرف کتب فروشوں سے کبھی کبھار جھڑپ ہوگئی ہے وہ بھی مکتبہ والوں یا احمد حسین جعفر علی کی دوکان والوں سے (تمکین!

آزادوں" کی قسم کے لوگوں کو دیدیجیئے تو استغفر اللہ وہ منطقی ترکیب
و تحلیل و تنقید فرمائیں گے کہ دماغ کے دو تین طبق الٹ جائیں گے مگر
کچھ سمجھ میں نہ آئیگا۔ اسلئے ہم تو ایک نہایت۔ غریب مضمون نگار کی
حیثیت سے ان سوالات کو حل کرتے ہیں۔ چنانچہ مولوی تمکین صاحب
کی تحریروں کے وزن اون کے وقار انکی قلیت انکی ترتیب انکی
ادبیت اور انکی تاثیری حیثیت سے پہلے غالباً [illegible] بہت ضروری
[illegible] اول آپ ہی نے مضمون نگاری کی تعریف کر کے دکھا دیا ہے۔
چنانچہ صاف عرض کرتے ہیں کہ [illegible] ہم اپنے [illegible]
برس کی عمر سے مضمون نگار ہو چکے ہیں اسلئے آپ کی [illegible] تحریر [illegible]
سوالات میں جو پہلا تحریر ہوا وہ یہ ہے کہ مضمون نگاروں [illegible]
[illegible] سے بہتر [illegible] سے زیادہ [illegible]
مضمون نگاری کی تعریف [illegible] کرتے ہیں اگر بہت [illegible] اور نصائح
[illegible] شاعروں اور مضمون نگاروں کی [illegible] میں
ایک [illegible] مضمون نگار [illegible] کسی محفل میں [illegible] کہا [illegible] بہت
کہا کہ [illegible] ہوا کہ [illegible] تمکین کی [illegible] اچھا لکھنے
والوں میں ہیں" اور تمکین اگر کوئی ان سے [illegible] مضمون
نگاری کی تعریف میرے نام سے لکھ دیجیئے [illegible] کروں گا تو

ئہ یہ بھی عجیب دلگی ہے کہ ملا صاحب [illegible] کی عمر [illegible] مضمون نگاری کی مدت [illegible] برابر
برابر ہیں صرف چند مہینوں کا فرق ہے۔ (تمکین)

پھر دیکھئے کہ جس رائے کو انہوں نے ملا رموزی اور تمکین کاظمی کے لئے
معمولی الفاظ میں ظاہر کیا ہے اسی رائے کو اپنے لئے لکھتے وقت ایسے
شاندار الفاظ میں لکھیں گے کہ دنیا اُن کے رتبۂ عالی کی قائل ہو کر رہ جائے
لہٰذا اس عادت کے موافق "محبہ ملا رموزی بقلم خود" کی یہی عادت ہی کہ
نہ کسی مضمون نگار کے مضمون کو کبھی پڑھنا نہ کبھی اسکی تعریف کرنا۔ مگر
اسی عادت سے ایک یہ قانون بھی بن جاتا ہے کہ جو مضمون نگار کبھی
کسی دوسرے مضمون نگار کی تعریف نہیں کرتا اگر وہ کبھی کسی مضمون نگار کی
. . . . تعریف کرتا ہوا دیکھ لیا جائے
یا پہچان لیا جائے یا بھانپ لیا جائے یا تاڑ لیا جائے یا پکڑ لیا جائے
یا سُن لیا جائے یا سمجھ لیا جائے یا جان لیا جائے یا مان لیا جائے تو
پھر یقین فرما لیجئے کہ ایسے ہی مضمون نگار کی تعریف اصل اور صحیح
تعریف ہو گی۔

لہٰذا ہم "رُو بقبلہ" ہو کر کہتے ہیں کہ ہم جو مولوی تمکین کاظمی کی مضمون
نگاری کے قائل ہوئے تو اس لئے کہ انہیں جب دیکھا یہی کہ "بس لکھ
رہے ہیں" اور "چھپوا رہے ہیں" یعنے اُنکی "کثرتِ نگارش" اور "حوصلۂ
عمل" اور اسی لئے تو ہم کسی ایسے مضمون نگار کے سلام کا جواب تک
دینا پسند نہیں کرتے جو بڑے "طمطراق" اور "دبدبے" سے سال

ڈیڑھ سال تک برابر لکھتے رہے اور پھر کہیں ملازم ہوئے تو افسر صاحب
کو سلام کرتے کرتے وہ اپنی تمام مضمون نگاری بھی بھول گئے اور شاعری
بھی اب کبھی کبھی دوستوں کے کہے بغیر کوئی دقیانوسی مضمون اٹھا لائے
اور یہ کہکر بیٹھے سنا رہے ہیں کہ دیکھئے ملا رموزی صاحب میں بھی کبھی
"اودھ پنچ" میں مضمون نگاری کرتا تھا مگر کیا کہوں جناب کہ اس
ملازمت نے کہیں کا نہ رکھا، اسلئے اب تو واللہ نہ کبھی اخبار پڑھنے کو
ملتا ہے نہ کوئی رسالہ دیکھنے میں آتا ہے۔

سبحان اللہ کیا دلیل ہے آپکی اور کیا فخر فرما رہے ہیں آپ سال
ڈیڑھ سال کی مضمون نگاری[له] پر، ارے بھئی آپ کے ہاتھ کتنے بڑے
تھے کہ آپ مضمون نگاری فرمائیں جبکہ آپ مالی مصائب کا مقابلہ
نہیں کر سکتے تھے اور قدرت کے کارخانہ میں آپ "منشی جی" اور "دفتری
آدمی" کہے جانے کے لئے ڈھالے گئے تھے۔

مگر تمکین کاظمی کہ یہ "اللہ کے بے حد لکھنے والے بندے" جب سے
مضمون نگار بنے ہیں استغفر اللہ جو کبھی جمعہ کے دن بھی مضمون لکھنا
ترک کیا ہو تو اس کثرتِ نگارش سے آپ کے نزدیک تمکین صاحب
کی بہادری ثابت ہوگی اور ارباب علم و فضل کے نزدیک انکی

له کیا فرماتے ہیں مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی ملا صاحب کے اس حسنِ ظن کے متعلق؟ (تمکین)

عالمانہ اور انشا پردازانہ فضیلت، کیونکہ جس شخص کے پاس علم و ادب
اور حکمت و خطابت کا جتنا زیادہ ذخیرہ ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ
لکھنے والا بن جاتا ہے اور جو یقین نہ ہو تو ذرا آپ اپنے ہاں کے
"کوتوال صاحب" سے اتنے مضامین لکھوا لیجئے جتنے کہ تمکین صاحب
لکھ چکے ہیں اور لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ کیونکہ وہ مضمون نگاری نہیں
ہے کہ سال بھر میں چار مضمون لکھ دیئے اور پھر ایک سال کے بعد ہی
ملازمت میں یوں جذب ہو گئے کہ پھر نہ ہمیں اور نہ آپ کو ملیں اور
نہ سی۔ آئی۔ ڈی۔ کو!

مجھے یہاں تمکین صاحب کی عام مضمون نگاری، اُن کے مضامین
کی محققانہ بلند نظری، عالمانہ پختگی اور ترتیب و تاثیر یہاں سے بحث
نہیں جبکہ یہ تمام کمالات انشاء اُنکی تحریر میں موجود ہیں مجھے تو یہاں
اُنکی لطافت نگاری سے بحث ہے۔ پس واضح ہو کہ اسوقت جبکہ
ملا رموزی نے لطافت نگاری اور ظرافت تحریر ہی کو انشاء اردو کا
ضروری حصہ قرار دینے کی کوشش کا آغاز کیا اسوقت اردو میں تین چار
آدمی ایسے تھے جو عید بقرعید پر ایک آدھ ظریف مضمون لکھ دیتے تھے
اور اردو میں لطافت نگاری کی یہی وہ "قحط سالی" تھی جس کے باعث
اس قسم کے دو کبھی کبھی کی نگارش بھی حد سے سوا مشہور ہو گئے۔ ورنہ انہیں

اپنے ان چند اور بہت ہی کم چند مضامین کے ذریعہ اتنا مشہور ہونا چاہیے
تھا۔ البتہ ملا رموزی کے بعد برادرم مولنا سالک بی اے، ایڈیٹر
اخبار انقلاب لاہور" نے ظرافت نگاری میں جس استقلال اور کثرت
نگارش کا ثبوت دیا وہ قابل تذکرہ ہے۔ ممدوح کے بعد ایسے
نوجوان لطافت نگار بھی پیدا ہوئے جنہوں نے چند دن تو ملا رموزی
اور سالک کے "پاؤں پر پاؤں رکھے" مگر سال ڈیڑھ سال کے بعد یہ بھی ایسے
ٹھنڈے ہوئے کہ آج نہ اخبار رسالوں میں پتہ ملتا ہے اور نہ اخبارات کی ہمت
آزما دنیا میں کیونکہ انہوں نے اخبار دنیا میں کبھی قدم ہی نہیں رکھا تھا تو واضح ہو کہ ایسے
چند روزہ لطافت نگاروں کی تحریریں نہ زبان اردو کو کوئی فائدہ نہ انکے مخاطب حضرات کو کوئی لطف،

اب اس کے بعد سوال یہ ہے کہ ظرافت کی صحیح تعریف کیا ہے
اور صحیح معنی میں ظریف کسے کہہ سکتے ہیں، سو اس کیلئے یہ "علی گڈھ
قسم کے لوگ" تو یورپ والوں کی لکھی ہوئی تعریفات کا ترجمہ پیش
کرکے بہت خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے جو تعریف پیش کی ہے بس وہ
دنیا میں سب سے آخری تعریف ہے اور "دیوبند قسم کے لوگ"
جب "اما بعد" لکھکر تعریف فرماتے ہیں تو یوں سمجھ لیجئے کہ گویا
کسی لغت کی کتاب کو نثر کر دیا ہے، مرجائیے مگر سمجھ میں ایک جملہ
بھی نہ آئے، رہے اپنے ملا رموزی صاحب سو یہ بیچارے ایسے

آدمی ہیں کہ یہ نہ انگریزی سے دلیل پیش کریں نہ عربی سے بس نہیں تو وقت پر جو سوجھ جائے اور جو سمجھ میں آجائے اس لئے اسوقت انکی سمجھ میں ظرافت کی تعریف یہ آئی کہ

"ظریف تحریر وہ جو پڑھنے والے کو اس موقع پر ہنسا دے"
"جہاں ہنسنے کے لئے اس کا دل نہ چاہتا ہو اور ظریف"
"وہ جو حد سے سوا ہنسی پیدا کرنے والی تحریر لکھتا چلا جائے"
"اور یہ نہ سمجھے کہ میں ظریف تحریر لکھ رہا ہوں"

بس یہی کمال ہے مولوی تمکین کاظمی کی تحریر میں انکی لطافت کا۔ اب رہا یہ سوال کہ آخر تمکین صاحب ظریف ہیں بھی یا نہیں اور اگر ہیں تو کب سے ہوئے؟ کس طرح ہوئے؟ کیوں ہوئے؟ کس لئے ہوئے؟ کس واسطے ہوئے؟ کس کے ورغلانے سے ہوئے؟ اور اب جو بن چکے ہیں تو بنے ہی رہیں گے یا نہیں؟ سو آخری سوال کا جواب تو یہ ہے کہ وہ تو بنے رہینگے۔ مگر انکی مخاطب جماعت کبھی انکی قدر نہ پہچانے گی نہ انکی کتابوں کو خریدے گی نہ انکے مضامین کا معاوضہ دیگی نہ انہیں اردو کی یہ اورنگ آباد سے لیکر پنجاب تک کی ایک انجمن کوئی خطاب دیگی نہ کسی حکومت سے انہیں منصب علمی ملے گا!

غرض یہ ہے کہ جب قوم اور مخاطب جماعت کی ناقدردانی اور حوصلہ شکنی کا یہ عالم رہیگا تو ایک تمکین کاظمی کیا اگر ہزار تمکین کاظمی ہونگے تو چاروناچار مضمون نگاری کو چولھے میں ڈالکر کسی دفتر میں ملازمت کر لینگے[1] "مجھ ملا رموزی قوم مسلمان ساکن ہندوستان" کے خیال میں تمکین ایک ایسے ذی حوصلہ اور بلند مرتبہ صاحب قلم ہیں جو محض اپنے ثبات عمل اپنے بلند پایہ مضامین کے باعث دنیائے علم و ادب میں تمکین کاظمی بنے ہیں۔

تمکین کے مضامین میں جو ظرافت ملتی ہے اگر سچ پوچھئے اور سچ لکھوائیے تو ملا رموزی اسے ظرافت نہیں بلکہ "دریائے لطافت" اسلئے کہتا ہے کہ ظرافت تو وہ ہوتی ہے کہ پڑھے اور مارے ہنسی کے چارپائی پر گر جائے یا دیوار سے ٹک جائے یا پیٹ پکڑ کر بیٹھ جائے اور لطافت وہ کہ پڑھے اور ایک ہلکے سے سرور کے ساتھ مست ہوجائے اسلئے انکی تحریروں میں غالب حصہ متانت اور رکھ رکھاؤ کا ہے اور بہت کم حصہ مذاق و تفریح کا مگر جس کم حصے میں انھوں نے ظرافت سے کام لیا ہے حق یہ ہے کہ وہ ظرافت اپنی اصولی بلندپایگی

---

[1] ابھی حضرت یہی کر رہے ہیں (تمکین)

اور تاثیر کے اعتبار سے نہایت درجہ قابل قدر اور دماغ میں وجد
وکیف کی امنگیں پیدا کرنے والی ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ "میں
ملّا رموزی ملازمِ سرکار بہ تنخواہ قلیل" جب تمکین کی لطیف تحریروں کو
پڑھ کر مسکراتا ہوں ہنستا ہوں اور قہقہے لگاتا ہوں تو پھر کون ہے جو
انکی روح پرور تحریروں سے بے خود نہ ہو جائے گا؟ کیونکہ میں اس
قسم کا ملا رموزی واقع ہوا ہوں کہ ہر وقت اپنے چہرے کو افسردگی
طرح "دبدبہ انگیز" بنائے رہتا ہوں، لوگوں سے بہت کم بات
کرتا ہوں، بات بات پر لڑنے کو تیار مگر مرنے کو "ناتیار" اور تو اور
مزاجی غرور یہ ہے کہ اپنے ہر مضمون میں اپنی تعریف خود لکھتا ہوں اور
ذرا نہیں شرماتا اس لئے میری اس خودستائی پر میرے عیوض وہ
بیچارے کوئی ڈھائی فٹ کے نہاشاعر شرماتے رہتے ہیں اور
تاؤ کھاتے رہتے ہیں تو پھر ایسا شخص جب تمکین کی تحریروں کو
اس بے خودی کے ساتھ پڑھے کہ "وہ" بھی دالان میں سے
ہنس کر کہیں کہ "بس سمجھ گئے ہم وہی حیدرآباد والوں کا مضمون پڑھ
رہے ہونگے آپ" گویا ہمارا کسی کتاب یا کسی رسالے کو پڑھ کر ہنسنا
ہمارے ننھے میاں کی والدہ کے نزدیک صرف اسی وقت یقینی ہے
جب کہ ہم تمکین صاحب کا کوئی مضمون پڑھیں۔ پھر جس مضمون کی

لطافت اور ظرافت کو شوہر کے ساتھ اسکی بیوی تک مان لے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ تمکین کی لطافت نگارش سے انکار کرکے کون ہوگا جو خود کو کافر قرار دیگا؟[۱]

تمکین صاحب کے ذیل کے مضامین "مرزا صاحب" "میر صاحب" "منشی جی" "بوکھلاہٹ" "جھٹکا" "عطردان" وغیرہ اوپر والی تعریف کے موافق اور نمونے ہیں۔ ان مضامین میں علاوہ ول لوازِ لطافت کے خاص سے بھی زیادہ اونچی خاص بات ان کے بیانکی سلاست ہے۔ اور بیان و مضمون کی آسان عبارت اور ترکیب ہی ایک ایسی صنعت ہے جو فن انشاء کا حسین ترجز ہے لہذا اس حساب سے میں تمکین صاحب کے مضامین کو بلند اور چوٹی کے مضامین کہنے کو تیار ہوں۔ انکی تحریر کا دوسرا حُسن زبان اور محاورے کا اہتمام ہے اور اگر اس معاملہ میں لکھنؤ والوں کی طرح زیر، زبر اور پیش کے سہو کو کمزوری اور "نالیاقتی" نہ کہا جائے تو میں کہتا ہوں کہ تمکین کی تحریریں ہر طرح اردو کی جان ہیں اور مال بھی۔

اُن کی تحریر کا تیسرا حُسن یہ ہے کہ وہ جس عنوان پر لکھتے ہیں

---

[۱] لیجئے اب مُلا صاحب کفر کے فتوے بھی دینے لگے اللہ کرے یہ "تہانہ بہوتی" رنگ اور زیادہ ہو۔ (تمکین)

اس میں وسعت نظر، تحقیق اور جزئیات کا بڑا مکمل ذخیرہ موجود ملتا ہے
پھر ان خوبیوں کے بعد اگر آپ چاہیں کہ وہ کفر کے فتوے بھی لکھیں۔
تب مضمون نگار ہیں تو یہ آپ کا ذوق، ورنہ مضمون نگاری کے اصول
سے کچھ شک نہیں کہ اونکے مذکورہ بالا مضامین وہ ہیں جن کے پڑھنے
سے دل ودماغ اور روح کو "حیاۃ آرا جوش" "خوشی" "مستی" اور
"بیداری" نصیب ہوتی ہے۔

پھر اگر آپ شوہر ہو کر اپنی بیوی کو مسرت و زندہ دلی کی دولت سے
شاد کام بنانا چاہتے ہیں تو اُن کے ان مضامین کو حاصل کر کے دوزخ
کی آگ[1] سے محفوظ ہو جائے۔ کیوں کہ مان لیجئے کہ جو شخص تمکین کاظمی کے
ان بہار افروز و عالم آرا مضامین کو نہ پڑھیگا خدا ہی ہے جو وہ دوزخ
سے محفوظ رہے

اور ہاں انکی تحریر کا چوتھا حسن یہ ہے کہ وہ دن کی روشنی سے
محروم ہیں یعنی "ملازمت پیشہ اور قوم سید ہیں۔" مگر اس قید وبند پر
وہ اس درجہ دلکشا تحریر سے زبان اردو میں ادب لطیف کا خزانہ
بہم پہونچا رہے ہیں۔ اللہ انہیں اور ملا رموزی کو ملازمت کی قید سے

---

[1] مسلمانوں عبرت حاصل کرو (تمکین)

آزاد کر کے ذرا "منصب[1] دار" یا "جاگیردار" تو بنا دے، پھر بتا دینگے کہ یہ دنیا میں صرف انگریز بھائی ہی زندہ دل ہوتے ہیں یا ہم ہندوستانی بھی!

بھوپال
۲۶ اپریل ۱۹۳۱ء

مُلّا رموزی

---

[1] ملّا صاحب کی دعا سے منصب تو نہیں اب بھی ہے خدا کرے اب ہماری دعا سے ملا صاحب کو منصب اور جاگیر ہو جائے (تمکین)

تقریب

از

مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی

بی اے (علیگ) ال ال بی (عثمانیہ) یم، آر، اے، ایس (لندن)

میں چاہتا ہوں کہ کتاب پر کچھ لکھنے سے پہلے مصنف کے حالات بھی بیان کر دوں تاکہ پڑھنے والے بے خبر نہ رہیں۔

تمکین صاحب کے اجداد ابتداً عرب سے بخارا گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ چونکہ یہ لوگ ہاشمی النسل اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ اسلئے بخارا میں عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز ہو گئے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے سیّد بابا خواجہ سیاحت کناں وارد ہوئے اور پھرتے پھراتے دکن پہونچے تو حیدرآباد میں اپنے ہموطنوں اور خاندان کے لوگوں کو بڑی بڑی خدمات پر فائز دیکھ کر خود بھی مستقل سکونت اختیار کر لی سید محمد طالب میر عسکر بخارا اور سیّد محمد عسکری صدر الصدور انہیں کے ہم جد تھے جن کے پوتے نواب فیریدوں جنگ رفیع الدولہ حیدر الملک تھے چونکہ اس زمانہ میں

---

[1] نواب رفیع الدولہ حیدر الملک بہادر دکن کے مشہور امراء سے تھے جن کے پوتے نواب

شرفاء کی قدر و منزلت خاص طور پر کیجاتی تھی اور تازہ ولایت شرفاء کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ اسلئے نواب میر معنی خاں[51] بہادر نے اپنی صاحبزادی سے جو نواب عبد اللہ خاں بہادر صوبہ دار آرکاٹ کی نواسی تھیں۔ سیّد بابا خواجہ کے فرزند سیّد ایوب خواجہ کی شادی کردی اور اس قرابت کے بعد سے ایوب خواجہ کی آمد و رفت دربار شاہی میں شروع ہوگئی۔ سید ایوب خواجہ کو پہلے میر سیادت علی خاں بہادر یار جنگ خطاب معہ لوازمات اور تعلقہ مشکی مدگل باجمعیت ... تحصیلدار ... گلبرگہ میں ... زانہ دار مقرر ہوے نواب سید یار جنگ بہادر کے کئی ایک لڑکے لڑ[کم] ۱۳۱اف سے ۱۳۲۳ف

چنانچہ سب سے بڑے فرزند نواب سید نور الحسن خاں ... رم تحصیلدار رہے اورنگ آباد کے میر عدل اور صدر تعلقدار تھے اور ... سے ۱۷ صفر ۱۳۲۶ھ کے علاوہ پانصدی منصب اور آٹھ ہزار سات سو روپیہ۔ حضرت تجلّی گو یوں تو تنخواہ سے سرفراز تھے آپ سے نواب عزت یار خاں ... لڑکے باقی رہے جن میں یا محی الدولہ[52] کی صاحبزادی بیاہی گئی تھیں آپنے ملین کاظمی ہیں۔ ۲۷ نومبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد

---

[51] میر معنی خاں بہادر، پانصدی منصب اور لوازمات سے ر[...] تھے "کوچۂ میر معنی خاں" اب تک مشہور ہے۔

[52] عزت یار خاں بہادر محی الدولہ (ثالث) مغفرت منزل مولوی قطب الدین محمود علی مرحوم معتمد خدمت صدارت اور احتساب بلدہ کے علاوہ جاگیر اور منصب سے بھی مستفید ... اور ڈاکٹر ولی الدین آپ ہی کے ... آپ ... حضرت بہبود علیشاہ قبلہ کے مرید افغان نے جبکہ آپ میانے میں بیٹھے ہوئے تشریف لیجارہے تھے خنجر

مطابق ٦ ادر ڈسمبر ۱۸۵۵ء کو انتقال کیا اور چار لڑکے اور دو لڑکیاں اپنی
یادگار چھوڑیں جن میں سب سے بڑے نواب میر سیادت علیخاں بہادر تھے
جو خدمت نیابت دوم دیوانی بلدہ اور آبائی منصب اور خطاب خانی
دری سے سرفراز تھے۔

نواب سیادت علیخاں بہادر نے چار شادیاں کی تھیں چنانچہ چوتھی
نواب عزیز الدین خاں بہادر بخت بلند جنگ کی صاحبزادی
بیگم کے بطن سے مولوی سید منتخب الدین تجلی تولد ہوئے۔
حالات بھی: تجلی حیدرآباد کے مشہور شعرا سے تھے اور مولوی تمکین
تمکین بی اور فارسی کی تکمیل مدرسۂ دینیہ نظامیہ اور دارالعلوم
مستقل سکونت کی تھی۔ حدیث فقہ وغیرہ کی تعلیم خانگی طور پر پائی
کاظم علیہ السلام کی دو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے فارسی کلام ترک
فائز ہو گئے۔ لہذا اردو نواب فصیح الملک داغ دہلوی کو دکھایا
کناں وارد ہوئے

سنہ ۱۲۹۲ھ
اپنے ہموطنوں اور خو والد کے انتقال کے تیسرے روز ۸ ربیع الثانی
خود بھی مستقل سکونت کو تولد ہوئے چھٹپن تک اپنی خالہ نواب
محمد عسکری صدر الصدور کی بیگم صاحبہ کے زیر پرورش رہے
فیریدوں جنگ رفیع پہنچنے کے بعد علاتی بہنوئی نواب میر

سلہ نواب رفیع الدولہ حیدر الملک

غیاث[۵] الدین علیخاں بہادر کے زیر نگرانی تعلیم پائی ۱۳۱۸ھ میں مولوی سید عبدالرحیم صاحب تعلقدار کی صاحبزادی اور مولوی سید محمد یوسف الدین مرحوم صوبہ دار گلبرگہ شریف کی ہمشیر زادی سے شادی کی ۱۳۱۱ف میں موعود الخدمتہ تحصیلداری ہوئے اور بحیثیت اناچی معتمدی مالگزاری میں کام کرتے رہے ۱۳۱۴ف سے مختلف تحصیلات پر مفرم تحصیلدار کی حیثیت سے کارگزار رہے ۱۳۱۶ف میں صوبہ داری گلبرگہ میں آپ کا تقرر ہوا اور ۱۳۱۸ف میں ضلع رائچور کے صدر خزانہ دار مقرر ہوئے ۱۳۲۲ف میں عثمان آباد کے محاسب ہو کر گئے۔ ۱۳۱۴ف سے ۱۳۲۳ف تک مستقلانہ خدمتہ تحصیلداری نہ مل سکی مگر ہمیشہ مفرم تحصیلدار رہے ۱۳۳۰ف میں گلبرگہ شریف پر خزانہ دار ہو کر آئے ۷ا صفر ۱۳۴۶ھ م ۱۶ اگسٹ ۱۹۲۷ء کو گلبرگہ ہی میں انتقال کیا۔ حضرت تجلی کو یوں تو کئی ایک لڑکے اور لڑکیاں ہوئیں مگر صرف تین لڑکے باقی رہے جن میں سب سے بڑے مولوی سید مصباح الدین تمکین کاظمی ہیں۔

تمکین صاحب ۲۶ شعبان ۱۳۲۰ھ م ۲۷ نومبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد

---

[۵] یہی نواب غیاث الدین علیخاں بہادر تھے جو بعد کو حضرت بہبود علیشاہ قبلہ کے مرید اور خلیفہ ہو کر میر غیاث الدین علیشاہ بن گئے۔ مولوی قطب الدین محمود علی مرحوم معتمد بارگاہ آپ ہی کے فرزند تھے اور ڈاکٹر میر ریاست علی اور ڈاکٹر ولی الدین آپ ہی کے پوتے ہیں

میں تولد ہوئے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور والد کے نگرانی میں پائی اور پھر دہرم ونت اسکول، مدرسہ اعزہ، مدرسۂ منصبداراں، مدرسہ مفید الانام اور دارالعلوم بلدہ میں فارسی، عربی اور انگریزی تعلیم پائی چونکہ آپکی والدہ نے مولوی سید محمد یوسف الدین صاحب مرحوم صوبہ دار گلبرگہ کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی تھی اور نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھیں اسلئے آپکی ابتدائی تعلیم بھی نہایت عمدہ ہوئی۔ حضرت تجلی خود شاعر اور ادیب تھے اور ہمیشہ علمی ادبی صحبتیں گرم رہتی تھیں اسلئے آپ پر بھی خاصا اثر ہوا اور آپ نے بھی شعر کہنا شروع کیا ابتدأً حضرت کیفی حیدر آبادی کو غزل دکھاتے رہے اور پھر حضرت محمد علیخان ناظم سے مشورہ کیا مگر جلد ہی شاعری سے جی اکتا گیا اور ایک دیوان مکمل کر کے شاعری ختم کر دی اور یہ اچھا بھی ہوا۔

چونکہ نثر سے بہت دلچسپی تھی اسلئے مضامین لکھنے کا شوق ہوا ابتدأً اخبارات میں سیاسی اور اقتصادی مضامین لکھا کئے مگر بعد میں تاریخ اور ادب سے کچھ ایسی دلچسپی ہوی کہ اسی کے ہو رہے!

قوام السلطنۃ وزیر خارجہ ایران کے فرانسیسی سے فارسی میں ترجمہ کئے ہوئے ناول "معاشقہ نپولین" اور گیٹھے کے شاہکار "ورتھر" کا ترجمہ میری شرکت میں فارسی سے اردو میں کیا اور آسکر وائیلڈ کے ڈرامے

"دی امپارٹنس آف بی انگ ارنسٹ" کو میری شرکت میں انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا۔ قویم السلطنتہ کے ایک اور فارسی ناول "شورشِ پرتوگال" اور ملکم خاں ناظم الدولہ کے ڈراموں "تیاتر" کو بھی اُردو کا جامہ پہنایا۔ چونکہ ریختی سے شغف تھا اور اس کا مطالعہ زیادہ کرتے رہے اسلئے شعراء ریختی کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دیدیا اب اردو شعر کہنے والی خواتین کا ایک مبسوط تذکرہ ترتیب دے رہے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک عمدہ چیز ہوگی ابتک سینکڑوں خواتین کے حالات اور کلام کے نمونے جمع کر لئے ہیں اور اس کاوش اور محنت سے اسکو ترتیب دے رہے ہیں کہ میرے خیال میں ابتدائے آفرینش اردو سے ابتک کی شاید ہی کوئی اردو شعر کہنے والی عورت ہوگی جس کا کلام انہوں نے نہ فراہم کیا ہو۔

آجکل ہیومرسٹ (خوش مذاق) میں وہ صفات ڈھونڈھے جاتے ہیں جو ایک نقال یا مسخرے یا بھانڈ میں ہونے چاہئیں اگر یہی معیار چند روز قایم رہا تو یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی خوش مذاق نہیں ملیگا بلکہ نقال، مسخرے، اور بھانڈ رسائل وصحائف کے اوراق پر منہ چڑھاتے نظر آئیں گے۔ غضب تو دیکھئے کہ آج ہر وہ شخص

ظرافت نگار بنا بیٹھا ہے جو حد درجہ گرے ہوئے اور رکیک مذاق سے صرف لوگوں کو ہنسادے اور بس زندہ دلانِ ہند نے وہ دادِ ظرافت دی کہ نہ صرف ایسے بیہودہ نگار ادیب بنا دیئے گئے بلکہ خاصے ظرافت نگار اور خوش مذاق بھی تسلیم کر لئے گئے ع

طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

اردو ادبیات کا مطالعہ گہری نظر سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اختیار کیا اور نہایت عمدگی سے لکھتے رہے ان کے بعد اور لوگوں نے کوشش کی مگر کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکے عظمت اللہ خاں مرحوم اور رشید احمد صدیقی نے اسی رنگ کو ذرا بدل کر بالکل علمی بنا دیا اور موٹے موٹے فلسفے اور نفسیات کے مسائل اسی طرز انشا میں ادا کرنا شروع کیا مگر ان حضرات کے مضامین کا معیار ذرا بلند تھا اسلئے عام لوگ انہیں زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اور یہ رنگ زیادہ مقبول نہیں ہوا خدا غریق رحمت کرے عظمت اللہ خاں نے بے وقت داغ مفارقت دیا اور رشید صدیقی نے مکروہات دنیا میں پھنس کر چپ سادہ لی ان کے بعد پطرس نے لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا مگر دو ہی ایک مضمون پطرس کے ایسے ہیں جو مقبول ہوئے چنانچہ

"کتے" اور "میں بھی ایک میاں ہوں" کے بعد کوئی مضمون ان کا اس قابل نہیں رہا جو قابل تذکرہ ہو یقین نہ ہو تو "مضامین پطرس" دیکھ لیجئے اسی زمانہ میں مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ نے بھی لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا۔

مضامین فرحت حصۂ اول و دوم دیکھ ڈالئے "مشاعرہ" "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی" "عالم بے کسی اور بے بسی" اور "کل کا گھوڑا" فرحت صاحب کے شاہکار ہیں۔

ملا رموزی نے بھی عجیب دل و دماغ پایا ہے ابتداً گلابی اردو کی سوجھی تو وہ وہ باریکیاں دکھائیں کہ سبھوں نے لوہا مان لیا اور پھر "نکات" کی طرف توجہ کی تو خاصا "لائٹ ہیومر" لکھنے لگے چنانچہ "نکات رموزی" حصہ اول و دوم "صبح لطافت" "شادی" جیسے ضخیم چار مجموعے مکمل کر دیئے اور اب "عورت ذات" کے نام سے ایک مستقل کتاب زیر طباعت ہے اور مختلف رسائل میں ان مجموعوں کی طباعت کے بعد جو مضامین طبع ہوے وہ خود اتنے ہیں کہ انہیں طبع کر دیا جائے تو اور دو تین مجموعے ہو جائیں۔

ملا رموزی نے سادگی بیان اور ظرافت کو پیش نظر رکھکر لکھنا شروع کیا اور اسی سلسلہ میں علمی، ادبی، اخلاقی، سیاسی، فلسفی، معاشی،

ہر قسم کے رموز و غوامض قلمبند کرتے رہے مگر اس اطمینان سے کہ پڑھنے والا سمجھے اور سمجھ کر ہنسے اور پھر غور کرے۔ شگفتگیٔ تحریر اور طنز نگاری مُلّا صاحب کا طرۂ امتیاز رہی ہے بعض مضامین مُلّا صاحب کے ایسے بھی طبع ہو جاتے ہیں جو ان کے اپنے رنگ میں رنگے ہوئے نہیں ہوتے اسکی وجہ انکی عدم توجہی نہیں ہوتی بلکہ "اجرتی مضمون" بے وقت لکھنا اور "غیر خوش باشانہ" (بغیر موڈ) وقت کی فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر ان سے قطع نظر کر لیجائے تو ملا صاحب اس کے مستحق ہیں کہ انہیں ہیومرسٹ مانا جائے اور بہترین ظرافت نگار تصور کیا جائے انہیں دنوں امتیاز علی صاحب تاج نے بھی "چچا چھکن" کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھنے لگے مگر ایک ہی دو مضامین کے بعد انہوں نے اسے ختم کر دیا۔

اس کے بعد سے تو ایک طوفان بدتمیزی بپا ہو گیا۔ ہر نا اہل و ناکارہ نے خوش مذاقی شروع کی کسی نے بڑے طمطراق اور شان و شوکت سے لکھنا شروع کیا تو کوئی فتنۂ محشر بن بیٹھا کسی نے اظہار انکسار کیلئے نا اہلی اور ناکارگی کا اعلان کر دیا تو کوئی فقط "کوئی" ہو کر رہ گیا مختصر یہ کہ

ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی
آپ ہی کہئے کہ آبروئے شیوۂ اہل نظر کیا باقی رہتی ہے؟

اس کے ذمہ دار یہ رکیک نویس اور ناکارہ نگار نہیں ہیں بلکہ مدیران رسائل اور رئیس التحریران مجلات و اڈیٹران جرائد ہیں۔ برساتی کیڑوں کی طرح رسائل اُبل پڑے مگر لکھنے والے وہی رہے جو پہلے تھے بھلا ایک ایک آدمی کتنے کتنے رسائل کیلئے مضامین لکھتا؟

نتیجہ یہ ہوا کہ پرانے لکھنے والوں نے ان جدید رسائل کی طرف سے کم توجہی برتی اور وہ "اطفالِ دبستاں" جو ابھی "مدرسوں" ہی کی چہار دیواری میں خواب طفلی دیکھ رہے تھے اور روزانہ اُوٹ پٹانگ مضامین لکھ لکھ کر رسائل کو بھیجا کرتے تھے اور وہ ردی کی ٹوکری میں ڈال دیئے جاتے تھے اب خاصے ادیب، ظرافت نگار اور کیا اور کیا بن گئے ؎

شاباش کیا کہنا ترقی اسکو کہتے ہیں
نہ تراشے تھے تو پتھر تھے جو تراشے تو خدا ٹھیرے

رسائل کی بہتات اچھے لکھنے والوں کا فقدان اور ایسے ناکاروں کی کثرت اب بھلا اردو کی پہلی تک پڑھے ہوئے "رئیس التحریر" اور "مغزن المفردات" تک پہونچے ہوئے حکیم جی انہیں ناکارہ نگاروں کو کارآمد سمجھ کر نہ چھاپیں تو کیا کریں کیونکہ عرب میں گھوڑے جب گراں ہو گئے اور لوگوں میں خریدنے کی استطاعت نہیں رہی تو

کام لینے لگے لمبے کان والے جانور سے! یہی ترکیب اگر پنجاب لکھنؤ دلی کے رسالے والوں نے کی تو کیا بُرا کیا؟ آپ کو بُرا ماننے کا کیا حق ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہے!

اس زمانہ میں جبکہ یہ بے تکی چل رہی ہو کوئی شخص کسی اچھے لکھنے والے کے مضامین پیش کرے تو کس طرح پیش کرے تمکین صاحب نے تو سرے سے مقدمہ لکھنے کی مخالفت ہی کی تھی صرف مجھ سے خواہش کر رہے تھے کہ ترتیب پر اظہار خیال کردوں مگر بغیر ان چیزوں کے اظہار کے جو قبل ازیں ظاہر کی گئیں اظہارِ خیال بے کار تھا اور پھر سرسری اظہار خیال کرنے سے نہ کرنا اچھا تھا چنانچہ مجھے مجبوراً اِن چیزوں کو ظاہر کرنا پڑا ممکن ہے کہ اِن سطور سے بعض لوگوں کو تکلیف ہو اور بعض بہی خواہانِ ناکارگان و خیر خواہانِ ظرافت نگاران باعظمت و شوکت نعل در آتش ہو جائیں اور مدیران و رئیس التحریران کو بھی اِن الفاظ سے تکلیف ہو مگر مجبوری یہ ہے کہ

اَلحَقُّ مُرٌّ

انہیں حضرات کی خفگی اور دل آزاری کے خوف سے ہم نے چند اشارے کر دیئے ہیں ؎

اندکے از غمِ دل گفتم و خاموش شدم　　که تو آزرده شوی ورنه سخن بسیار است

(اقبال)

تمکین کی ظرافت نگاری میں آپ کو عام جملے ملینگے نہ پیٹنٹ فقرے اور نہ وہ رکیک مذاق نظر آئے گا جو عام طور پر آج کل کے مضمون نگاروں میں پایا جاتا ہے۔

حضرت ملا رموزی سیاسیات کی وجہ مشہور ہوئے۔ مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ نے گذشتہ تہذیب و تمدن کے ماتم میں نام پایا۔ پطرس نے چند بے ساختہ جملوں کو جوڑ کر خاص کیفیت پیدا کر دی اور بس انہیں سے مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کی زبان کا کیا کہنا ماشاء اللہ دہلی کی میٹھی میٹھی آب حیات سے دھوئی ہوئی زبان صاف ستھرہ روزمرہ ملا رموزی صاحب کی اردو بھی ماشاء اللہ بامحاورہ اور اچھوتی۔ البتہ پطرس صاحب گو نے کا استعمال اور "زندہ دلوں" کی طرح غلط نہیں کرتے مگر زبان پر تب بھی "امروہہ پن" خاصا موجود ہے باوجود سلاست نگاری کے ایک وزن پڑھنے والے کے دل اور دماغ پر مسلط ہو جاتا ہے اور زبان بھی ذرا لڑکھڑانے لگتی ہے

اُن کے مقابلہ میں تمکین صاحب کی زبان ~~پطرس سے کرور درجہ~~ بہتر ملا رموزی کے برابر برابر ہے۔ انکی زبان میں مرزا فرحت صاحب کی سی مٹھاس اگر نہیں تو گراں باری بھی نہیں ہے میری دانست میں ملا رموزی، مرزا فرحت اور تمکین تینوں اپنے اپنے رنگ میں کامل ہیں

دین اللہ کی ہے رنگ ہے اپنا اپنا

جی چاہتا ہے ان تینوں ظرافت نگاروں کے مضامین کا مقابلہ کر کے دکھاؤں کہ کس پر کس کو فوقیت ہے مگر میرا منشا یہ نہیں کہ تمکین کو ملا رموزی یا فرحت آکا سے بڑھا دوں میں نے پہلے ہی کہدیا ہے کہ تینوں اپنے اپنے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

تمکین میں فرحت آکا سی بے ساختگی اور شیرینی الفاظ موجود ہی تو ملا رموزی کی سی طنز نگاری اور چلبلاہٹ بھی بدرجۂ اتم ہے۔ پطرس کی سی لطافت خیال ہے تو سجاد کی سی جدت بھی ہے بہر حال میں خوش ہوں کہ آج وہ چیز پیش کر رہا ہوں جو ہر حیثیت سے کامل ہے اور میں جس شخص کو پیش کر رہا ہوں وہ موجودہ دور کے لکھنے والوں سے بہتر نہیں تو بدتر بھی نہیں۔

اردو میں سرے سے لائٹ ہیومر (خوش مذاقی) ہی مفقود تھا اگر کچھ تھا بھی تو صرف مزاحیات کی حد تک تنقید فکاہی اور طنزیات سے لوگ آشنا ہی نہ تھے بعض لوگوں نے ایک آدہ مضمون لکھ دیا مگر کسی نے مستقل طور پر "فکاہیات" کو اپنا عنوان نہیں بنایا اسی کی ایک کڑی تشخص نگاری بھی تھی جو سرے سے اردو میں تھی ہی نہیں اردو میں تشخص نگاری کو مستقل طور پر رواج دینے اور اس موضوع پر بے تکلف قلم اٹھانے کا

فخر اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ تمکین ہیں کہ انہوں نے "میر صاحب" "مرزا صاحب" "خانصاحب" "مولوی جی" "منشی جی" لکھ کر بقول وکٹر ہیوگو یہ ثابت کر دیا ہے

"ہر ایک چیز کا ایک عنوان اور ہر چیز کسی صاحب کمال کی
منتظر ہے وہی پیش پا افتادہ باتیں جن پر ہم قلم اٹھانا کسی
زمانے میں خلاف علمیت سمجھتے تھے آج دنیا کے ادب میں
عظمت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور ان پر روشنی ڈالنا
معراج کمال کا ثبوت ہے"

ہربرٹ ایلس کہتا ہے۔

"جو کچھ دنیا میں ہو سکتا ہے بیان کیا جا سکتا ہے مگر ضرورت ایسے آدمی کی ہے جو اسے بیان کرنا جانتا ہو"

اسکو پیش نظر رکھکر آپ "چارلی چاپلن کا تماشا" "بوکھلاہٹ" "مضمون کیسے لکھتے ہیں"۔ "ہم اور ہماری عید"۔ "ہم مضمون کیوں نہیں لکھتے"۔ پڑھئے دیکھئے کیسے پیش پا افتادہ اور روزمرہ کے واقعات کس مزے سے بیان کئے گئے ہیں۔ یہی حادثات آپ پر بھی گزرتے ہیں، مگر آپ انہیں قلمبند نہیں کر سکتے اسی لئے تو "نوالس" نے کہا ہے "ہماری زندگی کے تمام واقعات مواد ہیں جن سے ہم جو چاہیں بنا سکتے ہیں"۔

مگر اس مواد سے کام لینا ہر ایک کا کام نہیں ہے اسکے لئے کسی
تمکین ہی کی ضرورت ہے۔

ادب اس کا نام نہیں کہ ہائے ولئے کے دُم چھلوں کے ساتھ چند
نامربوط اور بے تکے الفاظ جوڑ دیئے جائیں اور نامانوس ترکیبوں کے
ساتھ ایک مضمون مرتب کر دیا جائے کہ "وہ ناچ رہی تھی اور میں مرگیا"
اور اسی بات کا تبنگڑ بنا کر صفحوں کے صفحے سیاہ کر دیئے جائیں آج کل
عام رجحان اس قدر خراب ہو گیا ہے اور بد ذوقی اتنی عام ہو گئی ہے کہ
ہر ایسا مضمون جسکا تذکرہ کیا گیا ادب لطیف خیال کیا جاتا ہے۔ عجب
ثم العجب! "میتھوارنلڈ" کہتا ہے۔

"ادب انسانی زندگی کی تفسیر ہے"

اسکی توضیح "آردی گاربان" نے اسطرح کی ہے۔

"کسی چیز کو دیکھنے کے بعد اسکے متعلق جو خیالات ہمارے دماغ
میں پیدا ہوں انہیں بہترین الفاظ میں قلمبند کر دینا ادب ہے۔"

آپ "جھوٹ"، "جھٹکا"، "منشی جی" کا مطالعہ کیجئے اور پھر
ان دونوں اقوال پر غور کیجئے خود سمجھ میں آجائے گا کہ ادب کیا ہے
حیدرآباد دکن کی طرز معاشرت تاریخ اور تمدن سے جس قدر ان
مضامین کو تعلق ہے اتنا ہی ادب سے بھی تعلق ہے یوں تو دکن کی

سینکڑوں تاریخیں لکھی گئیں لیکن کسی میں بھی آپ کو حیدرآباد کے معاشرتی پہلو تمدنی نکات اور معاشی باتیں نہیں ملینگی مگر آپ "میر صاحب" "مرزا صاحب" "مولوی جی" "منشی جی" "خانصاحب" "گھبراہٹ" "جھوٹ" "جھٹکا" پڑھ کر حیدرآباد کی سینکڑوں ایسی باتوں سے واقف ہو جائینگے جنھیں کبھی آپنے سنا ہی نہیں ہے۔

کبھی آپ حیدرآباد کے محرم میں "لنگر" دیکھ رہے ہونگے۔ "رنگ" کھڑا ہوا نظر آئے گا۔ "نعل صاحب کی سواری" "ندی کا میلہ" بھی آپ کے پیش نظر ہونگے تو کبھی آپ حیدرآباد کی طغیانی" کے حالات پڑھ کر یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ آپ کے سامنے ہی سب کچھ ہوا ہے، کہیں آپ کو "آخری چہار شنبہ" کے جلسے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی پارٹیوں کا حال نظر آئے گا تو کہیں حیدرآباد کی سب سے پہلی اجرت پر لکھنے والی ہستی "منشی" کو دیکھیں گے کبھی آپ کو حیدرآباد کے "جھٹکے"۔ اور "جھٹکے والے" سے روشناس کرایا جائے گا تو کبھی "سیکل" سے بہر حال آپ از جزو تا کل چھوٹی سے چھوٹی بات تک دیکھ لینگے اور محسوس کرنے لگیں گے کہ حیدرآباد کیا تھا کیا ہو گیا اور آئندہ کیا ہونے والا ہے؟

کون کہہ سکتا تھا کہ "طغیانی" میں برباد ہو کر حیدرآباد پھر

"عروس البلاد" بنے گا کسے خبر تھی کہ محرم کے "رنگ" "سوانگ" "میلے ٹھیلے" "جاترا" "جھگڑے" اسطرح غائب ہو جائیں گے کہ آج اُن کا تذکرہ گذشتہ تہذیب تمدن کی یاد دلانے والا ثابت ہوگا کسے خبر تھی کہ حیدرآباد سے "پتنگ بازی" "مرغ بازی" "بیٹر بازی" "کشتی" "بنوٹ" "بانک" ۔ چھری ۔ گدکا ۔ جاکر ۔ سینما ۔ ناٹک ۔ ٹاکنگ فلم ۔ ٹینس ۔ اور بیاڈمنٹن" رہ جائیں گے ۔ کون کہہ سکتا تھا کہ "رتھ" "برقعہ گاڑی ۔ ڈولی ۔ میانہ ۔ پالکی ۔ نالکی ۔ ہودہ ۔ عماری شکرم ۔ جوڑی ۔ چھکڑا ۔ جاکر ۔ جھٹکہ" سکتا رہ جائیگا اور "موٹروں" کی وہ کثرت ہو جائے گی کہ بہترین سے بہترین کار ہر گلی کوچے میں "تیار ملیگی" کون واقف تھا کہ حیدرآباد والے شاہا ۔ جھبہ ۔ عمامہ ۔ شملہ ۔ انگرکھا ۔ کلی چھوڑ کر "ترکی" اور ایرانی بلکہ امان اللہ خانی" ٹوپی پر اُتر آئیں گے اور شیروانی کو ملکی لباس بنالیں گے ۔ ساتھ ہی ساتھ "کوٹ پتلون ۔ ٹرکش کوٹ" واٹر پروف بھی جزو لباس ہو جائیں گے اور فلٹ کیپ اور سن ہیٹ کا عام رواج ہو جائے گا سچ ہے ۔

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہل جہاں انقلاب کہتے ہیں

تمکین کے اُن مضامین سے آپ کو حیدرآباد کی تمام اخلاقی حالت بھی کما حقہ معلوم ہو جائے گی۔ "رسکن" کہتا ہے۔

"کسی قوم کا ادب اسکی اخلاقی حالت کا صحیح ترجمان ہوتا ہے"

"عورت اور اسکی نفسیات" پر تمکین مدت سے عبور حاصل کر رہے ہیں، چنانچہ اس موضوع پر انہوں نے ذاتی مشاہدے اور شخصی مطالعے کے علاوہ بہترین ذخیرہ کتب بھی فراہم کر لیا ہے، چنانچہ آپ "عطردان" "بدحواسی"، "چارلی چاپلن کا تماشا"، "بوکھلاہٹ۔ ہم اور ہماری عید" "مضمون کیسے لکھتے ہیں۔ ہم مضمون کیوں نہیں لکھتے۔ شادی سے پہلے" پڑھ کر اس کا اندازہ کر سکیں گے کہ تمکین نے عورت کو کس قدر سمجھ لیا ہے

یہ معلوم کرکے آپ کو حیرت ہو گی کہ تمکین ابتک مجرد ہیں اللہ واسطے کو "منگنی" تو کر لی ہے[1] مگر اس بے تکلفی سے عورت کے متعلق قلم اٹھاتے ہیں کہ بعض لوگوں کو اس امر کا یقین اور پختہ یقین ہے کہ تمکین شادی شدہ اور "گھر داماد" ہیں[2]۔

انہیں مضامین سے آپ کو تمکین کے چند خاص خاص اور زیادہ ملتے جلتے رہنے والوں کا کردار (کیرکٹر) بھی معلوم ہو جائے گا اور

---

[1] انشاءاللہ کبھی شادی بھی کر لینگے۔ [2] خدا نکرے۔ (تمکین)

پھر خود تمکین کا "نظام الاوقات" بھی نظر آئے گا اور مصروفیت بھی ـــــ

ان مضامین میں تمکین نے اپنی زندگی کے اکثر واقعات کو بالکل صحیح طور پر بے نقاب کر دیا ہے اور ایسے پوست کندہ حالات جنکو ظاہر کرنا لوگ عین بدنامی تصور کرتے ہیں تمکین نے بکمال جرأتِ اخلاق لکھ دیا ہے اور اس مزے سے کہ

من نہ کردم شما حذر بکنید

کہنے کے بجائے ان واقعات کا اظہار بے انتہا مفید اور ناصحانہ ثابت ہوگا۔ ممکن ہے کہ آیندہ کوئی شخص تمکین کی سوانحِ حیات لکھنے بیٹھے تو یہ واقعات اسے مواد کا کام دینگے[1]

ہندوستان نا اتفاقی کے ہاتھوں برباد ہو ہی رہا ہے مگر علمی اور ادبی برادری کو کم از کم اس نجاستِ نا اتفاقی سے آلودہ نہ ہونا چاہئے تھا مگر اس کا کیا علاج کہ یہ طبقہ بھی اس "حمام" میں "ننگا" ہی نظر آتا ہے۔ مجھے یہ دیکھکر سخت تکلیف ہوتی ہے کہ تمکین سے رشک، حسد، اور بغض رکھنے والوں کی تعداد بہت کافی ہو گئی ہے بعض تو محض اسلئے تمکین سے بغض رکھتے ہیں کہ انکو اس قدر شہرت کیوں ہو گئی؟

---

[1] خدا کرے ایسا ہی ہو۔ تمکین عفی عنہ

اور بعض اس لئے کہ یہ جو عمدہ عمدہ اور لطیف ترین مضامین تمکین کے قلم سے نکلتے ہیں۔ ہمارے نام سے کیوں نہیں چھپتے! یہ تو ان لوگوں کا حال ہے جو لکھے پڑھے ہیں۔ مگر بعض ایسے لوگ بھی جو "اردو کی چوتھی" اور "آمدن سی لفظی" کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں جانتے اب تمکین کے خلاف پروپاگنڈا کرنے لگے ہیں۔ گو تمکین کو ان حاسدوں کے پروپاگنڈے کا افسوس ہوتا ہے اور نہ ان کے اسطرح جل جل کر کلابتوں" ہونے کا رنج مگر یہ کس قدر رنج دہ بات ہے کہ وہ "بدوی" جو نہ تو مہذب اور متمدن ہی ہوں اور نہ انہیں "قہوہ خانے" یا "خر دے کی دوکان" کے علاوہ کوئی سوسائٹی ہی ملی ہو جو ایک سطر اردو لکھ سکتے ہوں اور نہ ایک سطر عربی اور فارسی پڑھ سکتے ہوں اور نہ ایک لفظ انگریزی کا سمجھ سکتے ہوں ایک ایسے قابل اور فاضل ادیب اور انشا پرداز سے خواہ مخواہ حسد رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں اگر کوئی دوسرا انشاء پرداز یا پڑھا لکھا شخص تمکین سے محض انکی شہرت اور عزت کی بناء پر رشک و حسد کرتا تو کوئی بات نہ تھی۔ ان "طویل القامتوں" کو معلوم ہونا چاہئیے کہ بقول "لنکن"

"تم کچھ لوگوں کو بے وقوف بنا سکتے ہو اور سب لوگوں کو تھوڑے

عرصے کیلئے دہوکا دے سکتے ہو" مگر ہمیشہ سب لوگوں کی آنکھوں میں خاک نہیں ڈال سکتے"۔

کیونکہ علمی اور ادبی حلقے میں اُن حاسدوں کا گذر نہیں اور اگر کسی "یورپ زدہ ڈاکٹریٹ" کی جوتیوں کے طفیل میں گذر ہو بھی گیا تو کون انکی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے اور ایک ایسے قابل انشاپرداز اور ادیب کے مقابلے میں کچھ کہنے سننے کا موقع دیتا ہے آخر یہ خود ذلیل[1] ہونگے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمکین کے اس مجموعۂ مضامین کی جس پر میں "تقریب" لکھ رہا ہوں خاصی مخالفت ہوگی اور یہ تمام نہاد ظرافت نگار اور "بدوی" حتی الامکان جد و جہد کرینگے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے" ایمرسن" نے کیا اچھی بات کہی ہے۔

"دوستانہ کوشش یا مخالفانہ جد و جہد کی بناء پر تمام"
"کتابوں کو استقلال نصیب نہیں ہوا ہے بلکہ اِن کو"
"شہرت دوام اِنکی مخصوص کشش کی وجہ حاصل ہوئی ہے"

چونکہ "غنچۂ تبسم" میں ایک مخصوص کشش ایک شہرت پانے کی قوت

---

[1] مجھے نہایت افسوس ہو کہ سعیدی صاحب نے بہت سخت لہجہ اختیار کیا ہے اور پھر اس حصے کے شائع کرانے پر مصر بھی ہیں (تمکین)

اور ایک ادبی وزن موجود ہے اسلئے یہ کتاب مقبول ہوگی اور خوب مقبول ہوگی۔ اور ایک دن وہ آئے گا کہ بقول حضرت احسن مارہروی
"تمکین کی نثر اکبر الہ آبادی کی نظم کی طرح بقائے دوام حاصل کریگی"۔

اور

پہلے پھولیگا یہ غنچہ گلستاں بوستاں ہوکر

غازی پورہ۔ گلبرگہ
۱۲ اپریل ۱۹۳۱ء

عبدالمنعم سعیدی

کام کم نام بڑا۔ نقاد

خوش باش دمے کہ زندگانی این است

غنچۂ تبسّم

مُندرجات

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۵	ترفا	شرفا	۲۹	۱	رمضان شریف	شعبان
۲	۳	طبقہ	تختہ	۳۴	۳	نموۃ العلما	ندوۃ العلما
۳	۲	شکشپیر	شکسپیر	〃	۱۳	زوز	زور
〃	۶	بلانگ	بلانک	۳۵	۱۳	لنزیز	لذیز
۴	۱۳	زموزی	رموزی	۴۸	۱۶	زور روز	زور زور
۵	۱۳	جنھوں بے	جنھوں نے	۷۲	۱۱	گولڈن تش	گولڈرش
۱۲	۹	ہواگزرا	ہو گزرا	۷۴	۷	خرانوں	خراٹوں
۱۹	۶	روز	زور	۷۷	۱	جدار	گرجدار
〃	۶	سلامت	سلاست	۹۵	۷	افرجانی	نافرمانی
۲۶	۱۱	صاحب بے	صاحب نے	۹۷	۱	سکرٹ	سگرٹ
〃	۱۷	موجودہ	موجود	۱۰۱	۱۴	بلاٹنک	بلاٹنگ
۲۷	۳	ہامونیم	ہارمونیم	۱۱۳	۱۰	ڈاگ	ڈاک

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱۷	۲	قلعہ کو جانے	قلعہ جانے
۱۱۸	۴	ستم علی	رستم علی
۱۱۹	۳	جھنڈے بانی	ٹھنڈے پانی
"	۴	کروٹ لی	کروٹ بدلی
"	۵	اٹھایا	اٹھالیا
"	۸	گود سے تر پڑا	گود سے اتر پڑا
"	۱۵	ہی	رہی
"	"	آگے بڑھکر	آگے بڑھ کر
"	"	بلائین	بلائیں
۱۶۹	۱۶	مں	میں
۱۲۱	۶	بیہ	یہ
۱۲۲	۲	ہمارسے	ہماری
۱۲۸	۵	لکشمندت	لکشمیدت
۱۳۳	۶	ممگن	ممکن
"	۱۳	پہ	بہ
۱۵۳	۱	کسی کھولے	کس کے کھولے
۱۵۵	۶	گرٹ	گزٹ
۱۵۷	۱۷	بگگھی	بگھی
۱۵۹	۱۷	سعد	بعد
۱۶۱	۱	ہی	یہی
۱۶۶	۱۴	لارالی بلائنٹ	لارالاپلانٹ
۱۹۰	۱۲	یاند	باندہ
۱۹۱	۱۴	منلاشی کے	منلاشی کہ

گپ

اللہ اللہ وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ ہر ایک شریف آدمی کی بیٹھک میں یا دیوان خانہ پر یار دوست جمع ہوتے تھے۔ حقہ پر حقہ تازہ ہوتا سماور پر سماور ختم ہوتا فنجانوں پر فنجانیں چڑھائی جاتیں بیڑے پر بیڑا چبایا جاتا اور گپیں اڑتیں، اور ایک یہ زمانہ بھی ہے کہ لوگوں میں گپ کا مذاق ہی نہیں کہ گپ کیا ہے، بس یہ سمجھ لیا ہے کہ گپ افیونیوں یا مداکوں ہی کی خاص چیز ہے شرفا، اور تعلیم یافتہ طبقہ اس سے قطعاً ناواقف ہے۔

حضرات! گپ بھی ایک فن ہے فنون لطیفہ میں سے اسکی ابتدا جنت میں حضرت معلم الملکوت نے کی وہی اسکے موجد ہیں دادا آدم سے وہ پہروں گپ بازی کیا کرتے تھے، حضرت آدم جب روئے زمیں پر تشریف لائے تو ان کے پاس دل بہلانے کی یہی ایک چیز تھی۔ اماں حوا اور بابا آدم ملکر اسی سے دل خوش کرتے تھے جوں جوں زمانہ بدلتا گیا تمدن و تہذیب میں

ترقی ہوتی گئی گپ نے بھی ترقی کی اور اعلیٰ مدارج حاصل کئے آج یہ ایک مستقل فن ہے اسکے جاننے والے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

یونان میں بڑے بڑے گپ باز گزرے ہیں انہیں بزرگوں نے تو طبقہ الٹوادیا، عرب میں بھی اس فن کے آئمہ قبل از جاہلیت اور بعد از جاہلیت گذرے ہیں علامہ واقدی جنکی تاریخ اور حدیثیں مشہور ہیں اس فن کے امام تھے انہوں نے نہایت سنجیدگی سے گپیں جمع کیں اور شہرت دی مگر یار لوگوں نے خواہ مخواہ انکی روایتوں کی تکذیب کی ایسے ثقہ امامِ گپ کو کاذب غیر ثقہ قرار دیکر انکی گپوں (حدیثوں) کو جھوٹی ٹھیرایا، ایک اور بزرگ بھی قدرت سے یہی دل و دماغ مانگ لائے تھے، چونکہ علامۂ واقدی کا انجام پیش نظر تھا۔ اس لئے انہوں نے "الف لیلہ" لکھی یہ بھی مجموعہ ہے گپوں کا جس کو اس قدر شہرت ہوئی کہ تمام مہذب زبانوں میں ترجمہ ہو گیا، عجم میں بھی اس فن کے بڑے بڑے امام ہوئے دیکھئے "شاہ نامہ" کتنی بڑی گپ ہے جو ابتک چلی آرہی ہے سکندر نامہ (جو امتحان منشی میں تا جنگ زنگیاں پڑھایا جاتا تھا) بھی ایک گپ ہی ہے، چچا سعدی نے بھی گلستاں میں نہایت سلیقہ سے گپیں لکھدیں جن کو پڑھ کر لوگ ابتک چکر میں ہیں اکثروں کو یہ خیال ہے کہ وہ ہندوستان آئے تھے، حالانکہ انہوں نے ایک گپ ٹھونکدی۔

یورپ میں بھی سلیقہ شعار گپ باز بہت ہوئے میاں رینا لڈز،

اس فن میں طاق تھے۔ انکی جس قدر تصانیف ہیں وہ بہت سنجیدہ یا غیر سنجیدہ گپ کی تعریف میں داخل ہیں بھائی شکسپیر نے بھی اس فن میں کمال کیا ہے اناطول فرانس، وکٹر ہیوگو، گیٹے، برنارڈ شا بڑے بڑے گپی ہیں ان میں سے دو نے تو "نوبل انعام" بھی اسی گپ بازی کے صلہ میں پایا، آرتھر کینن ڈائل بھی بڑے حضرت ہیں۔ انہوں نے ایک طرف روحانیت میں گپ بازی کی اور دوسری طرف شرلک ہومز جیسی گپ چھوڑی، مارس لی بلانگ کو خدا سلامت رکھے انکی گپیں لال برادرز کے طفیل میں لالہ تیرتھ رام جی ترجمہ کر رہے ہیں۔ ان کی جیتی جاگتی گپ آرسین لوپن ہے، یہ اُدبا کا طبقہ تھا علما اور ماہران فنون بھی اس لطیف شئے کو نہیں بھولتے میاں ڈارون نے ایسی گپ دی کہ آج تک لوگ چکرا رہے ہیں بعض بزرگ معمل، یا رصدگاہ میں بیٹھے بیٹھے نئی نئی گپیں اڑا دیتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ آیندہ سو سال میں انسان چھ انچ کا رہ جائے گا تو کوئی چوبیس گھنٹے میں دس منٹ کی نیند کافی ہونے کا اعلان کرتا ہے کوئی ستارو نکے ٹکرانے سے آدھی دنیا کی تباہی کی خبر دیتا ہے۔ تو کوئی عالمگیر جنگ کا اعلان کرتا ہے، بہرحال ہر سنجیدہ شخص مصروف گپ بازی ہے۔ خدا رکھے ہندوستان جنت نشان کو یہاں بھی یہ فن شریف بہت ترقی کر چکا ہے، بعض گپیں سینکڑوں سال سے چلی آتی ہیں "کلیلہ و دمنہ" والی گپ کیسی ہے "کوک شاستر" یا "کوکا پنڈت" والی گپ سے عقلمند تا شرابتک فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر یہ

[illegible] ہوئی تو یقین ہے کہ [illegible]

خود ہمارے ہندوستان [illegible] گپ بازی کی جو ایک [illegible]

ہندوستان کے بڑے بڑے تاریخی واقعات [illegible] گپ بازی کی بدولت ہوئے

دہلی کی بچی کھچی سلطنت اسی گپ [illegible] کا غدر

بھی ایک معمولی گپ کا نتیجہ تھا [illegible] گپ کے طفیل مشہور ہوا

''کلکتہ کے کالے گھر'' والی گپ تو آپ نے تاریخ میں دیکھی ہو گی۔ مہاتما جی

کی سوراج والی گپ کا کیسا زور و شور رہا۔ مولانا محمد علی کی ہندو مسلم اتحاد کی

گپ کتنا کام کر رہی ہے۔ حسن نظامی کی ایک چھوٹی سی ''پان اسلام ازم'' والی

گپ کی وجہ مولانا محمد علی کیسے بگڑے۔ خواجہ صاحب کی تبلیغ والی گپ کتنی

کامیاب گپ ہے۔

ان کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی گپ باز ہیں سر رابندر ناتھ ٹیگور

نے گپ میں شاعری کی اور ''نوبل انعام'' ہتیا لیا۔ منشی پریم چند کی افسانہ نما گپیں

اور منشی سدرشن کی گپیں۔ اور بہیا زموزی کی مختصر اور مفید گپیں حوادث اور گلابی

اردو کی شکل میں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ کیا نام کہ حاجی بلغ العلا کی گپ بازی

ہمدرد کی جان تھی۔

اخباری دنیا میں سب سے سنجیدہ گپ باز رائٹر ایجنسی ہے جو نت نئی

گپیں مشہور کرتی ہے۔ اسکے بعد پنجاب پریس جو آئے دن گپوں کے ذریعہ ہندو مسلم

جذبات کو مشتعل کرتا رہتا ہے۔

دکن میں بھی یہ مذاق قدیم سے ہے "جذبات و مہیار" والی گپ سب سے پہلے دکن ہی سے نکل کر ہندوستان تک پہونچی، میاں منصور کی انا الحق بھی یہیں کی پیداوار ہے، تغلق کے مظالم کی گپ بھی یہیں سے اڑی اور امیران صدہ نے یہیں بغاوت کی جسکی وجہ سلطنت بہمنیہ کی بنا پڑی اور آخر میں انہیں گپوں نے اسے توڑ کر پانچ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم کیں تا تاناشاہ کے رنگ رلیاں بھی گپ تھیں عالمگیر کے طیش سے سنجیدہ صورت اختیار کرلیں۔ مہاراجہ چندولال کے زمانہ کی گپیں آپ نے سنی ہونگی۔

اب بھی بفضلہ تعالےٰ دکن میں گپ باز موجود ہیں "مرزا الم نشرح" ایک فاضل گپی ہیں آپ کی دو گپیں مجلہ عثمانیہ کے پہلے اور دوسرے نمبروں میں بھی طبع ہو چکیں ہیں، تیسری گپ دہلی کے مشاعرہ کے عنوان سے اردو میں چھپی ہے اب تو ان گپوں کا مجموعہ "مضامین فرحت" [1] کے نام سے کراؤن مارک سیاہی میں چھپ چکا ہے جس پر ہمارے دوست کی ایک تاریخ بھی کندہ ہے، جنھوں نے "برس" کا قافیہ "ہنس" لکھ مارا یہ بھی ایک گپ ہے، اب ہمارا ارادہ بھی نظام گزٹ میں ایک مستقل سلسلہ گپ شروع کرنے کا ہے مگر یہ گپ کچھ زیادہ سنجیدہ نہ ہوگی یعنے ان گپوں سے فسادِ گلبرگہ کی طرح کوئی ہنگامہ نہ ہوگا، صرف تھوڑی دیر قہقہہ بازی اور پھر خاموشی، یہ صرف تمہید ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

---

[1] اب تو حصہ دوم بھی طبع ہوگیا۔ حصہ سوم، چہارم، پنجم

میر صاحب

یوں تو میر صاحب سے ہزاروں آدمی واقف ہیں مگر ان کا نام شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ میر صاحب ہر ایک کی زبان پر چڑھا ہوا ہے کم از کم ہم نے تو انہیں کسی دوسرے نام سے مخاطب کئے جاتے نہیں سنا سبھی میر صاحب کہتے ہیں۔

میر صاحب کے قویٰ نہ جانے کیسے ہیں کہ نہ تو وہ گھٹتے ہیں نہ بڑھتے ہیں وہی سفید ہرک کی شیروانی کپڑے کی گنڈیاں ٹکی ہوئی۔ ہرک کا پاجامہ ٹخنوں سے اونچا سفید ململ کا شملہ الٹا سیدھا لپٹا ہوا کندھے پر صوفیانہ چرپالی رومال پاؤں میں مارکٹ کا نعل لگا ہوا سرخ چڑھاؤ۔ جیب میں سیاہ مقوے کی ناس کی ڈبی سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں آخری چہار شنبہ کا چھلا اور الٹے ہاتھ کی چھنگلیا میں مضر آ شیروانی چھاتے اور مونڈوں پر پان کے سرخ سرخ اور ناس کے سیاہ سیاہ دھبوں سے مزین، اس حال میں ہم میر صاحب کو آج کل سے نہیں اٹھارہ انیس سال سے دیکھ رہے ہیں۔ بھرا بھرا جسم متوسط قد سخت سخت ہاتھ پاؤں سر گھٹا ہوا

گھنی گرد ڈاڑھی جس میں بعض بعض سفید بال بھی ہیں، مونچھیں بالکل کتری ہوئی۔ کان پر لانبے لانبے بال، خط صاف بنا ہوا، ہاتھ میں "تنبیہ الغافلین" یعنے موٹا سا ڈنڈا جس کی شام لوہار سے ہر دوسرے مہینے میں بنوائی جاتی ہے۔

چونکہ میر صاحب، ہمارے بزرگوں کے ملنے والے ہیں، اسلئے ہم پر بہت مہربان رہتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ میں بھی پُر خلوص بزرگ والد مرحوم کے انتقال کی جب اطلاع ملی تو ہمیں ڈھونڈنا شروع کیا دو دفعہ گھر پر بھی آئے مگر ہم نہ تھے ایک دفعہ ہم گھر سے نکل ہی رہے تھے کہ حضرت مل گئے، بس لپٹ ہی تو گئے دیر تک والد مرحوم کو یاد کر کے روتے رہے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ سڑک پر کھڑے ہوئے نہایت ہی بے تکلفی سے گفتگو کرتے رہے ہم نے کہا "تقصیر چلئے، تھوڑی دیر تشریف تو رکھئے" میر صاحب تیار ہی تھے دیوان خانہ میں آکر بیٹھ گئے، ہماری ملازمت، منصب، والد کی علالت، موت، تجہیز و تکفین، بچوں کی تعلیم، وغیرہ وغیرہ کے متعلق نہایت ہی سنجیدگی سے جرح کرتے رہے، ہم نے اس غیر دلچسپ بحث کو ختم کرنے کیلئے حیدر آباد کے محرّم کا بے تکا ذکر کر دیا، بس میر صاحب کی آنکھیں بھر آئیں ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے۔

"میاں[1] آج کل محرّم میں رکھا ہی کیا ہے تم کو شاید آخری زمانہ کی کچھ باتیں

---

[1] میر صاحب کی زبان کے ذمہ دار ہم نہیں ہم نے نقل کی ہے انہوں نے جو کچھ کہا جنہیں لکھنؤ یا محاورہ زبان وغیرہ کی نسبت اعتراض ہو تو گڑھے صاحب کی گلی میں میر صاحب کو ڈھونڈ کر ان سے گفتگو کر لیجئے۔ (تمکین)

یاد ہوں گی کیسی دلچسپی رہتی تھی کیا زمانہ تھا واللہ وہ دن یاد آتے ہیں تو کلیجے پر سانپ ہی تو لوٹ جاتا ہے۔ ہائے ادھر چاند نظر آیا اور ادھر علم استادہ ہوگئے۔ گھر گھر علم گلی گلی الاوہ کوچہ کوچہ آبدار خانہ وہ چہل پہل وہ بھاگ دوڑ اب کہاں اللہ اللہ لنگر کے کیا کیا انتظامات ہوتے تھے مہینوں پہلے بنگلے کرایہ پر لیے جاتے فرش وغیرہ کا انتظام ہوتا۔ اور لوگ منہ اندھیرے آکر بیٹھ رہتے گیارہ بارہ بجے مشعل لگتی رات کے (۱۲) بجے تک سلسلہ جاری رہتا خدا جنت نصیب فرمائے۔ حضور جنت آشیاں کو پنج محلہ پر رونق افروز رہتے کوتوالی کا باضابطہ انتظام رہتا تھا دور دور سے لوگ صرف لنگر دیکھنے آتے تھے۔ واللہ جب اکبر جنگ کوتوال کا ہاتھی سامنے سے گذرتا تو اچھے اچھے سورماؤں کے کپکپی پڑجاتی وہ گراں ڈیل کوہ پیکر ہاتھی وہ انکی خاص عماری اور اس پر اکبر جنگ کا خاص انداز میں بیٹھنا ہاتھی کے دو طرف دو جلاد کھڑے (تیغے) ہاتھوں میں لئے سرخ سرخ آنکھیں چمکاتے ہوئے چلتے تھے آہ ایک سے ایک بارعب ایک سے ایک بانکا جوان مندوزی جمعدار بڑکمر والے برق جنگ، سلطان نواز جنگ، اور دوسرے بڑے بڑے جمعدار، کمنداں، رئیس کیسی شان سے نکلتے وہ تمہارے محلہ والے نواب عباس علیخاں! ہائے لنگر کیا ہوتا تھا شہر کے بانکوں ترچھوں کی نمائش ہوتی تھی نمائش اجی معمولی پیادوں میں تک ایک بانکپن تھا، اونچی چولی کا انگرکھا کمر بندھی ہوئی طپنچہ، کٹار، زیب کمر ہاتھ میں عباسی سر پر پگڑی جب

ٹھنٹے ہوئے چلتے تو زمین لرزنے لگتی زمین! اور پھر افسر سے لیکر سپاہی تک بات بات پر کٹ مرنے تیار! ایک دفعہ سلطان نواز جنگ کا ہاتھی جس پر بچے سوار تھے شاید روک دیا گیا یا واپس کر دیا گیا۔ بس غضب ہی تو ہو گیا۔ جمعدار نے جمعیت تیار کرائی۔ اجی وہ خون خرابی ہوتی کہ سارا شہر لٹ جاتا مگر خدا جنت نصیب کرے مرحوم سرکار نے روکدیا۔ تمہارے والد بھی تو اکثر سلطان نواز جنگ کے پاس رہتے تھے۔ ایک دفعہ وہ اور لڑکوں کے ساتھ ہاتھی پر نکلے۔ ظالم ایسا مست تھا کہ بس بگڑ کھڑا ہوا چوک سے سیدھا نکلا تو پرانا پل پار ہو کر کاروان میں دم لیا۔ ہم بھی حسینی علم کے پاس کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے خیر یہ ہوئی کہ فیلبان آدمی سمجھدار تھا آہستہ آہستہ روک کر واپس لایا ورنہ غضب ہو جاتا۔ تمہارے والد پورا قصہ تفصیل سے بیان کرتے تھے۔ میاں اس زمانہ میں کیسے کیسے رنگ تھے یہ جو تم تھیٹر تھیٹر کر کے رٹتے ہو۔ یہ اس کے سامنے کوئی چیز نہ تھی۔ نتھو بیگ کا رنگ، طیب علی کا رنگ ان کا رنگ اُن کا رنگ کیسے کیسے استاد تھے، ہم نے الفریڈ کے ناٹک بھی دیکھے اور رکھشا وکے بھی۔ حج کو جاتے ہوئے بمبئی میں ہم نے غافل مسافر کا کھیل بھی دیکھا مگر میاں! وہ بات کہاں ہائے ظالم غضب کرتے تھے غضب! کیسی کیسی نقلیں اتارتے تھے کیسے کیسے سوانگ لاتے تھے وہ ناچنے والے وہ گانے والے اب کہاں اجی چوبیس چوبیس گھنٹے ایک ہی نقل ہوتی تھی بیچ محلہ مبارک پر حضور رونق افروز رہتے نیچے رنگ ہوتا دو دو دن چار چار دن مسلسل ایک رنگ شہ کھڑا

رہتا۔ ہائے میں تم کو کس طرح سمجھاؤں تم نے آخری رنگ تو دیکھے ہیں اُس وقت وہ بات نہ تھی۔ کیسے دل چلے لوگ تھے۔ جس کو چاہتے بنا دیتے۔ جس کی چاہتے ہنسی اڑاتے، محسن الملک، نذیر احمد، حسن بلگرامی تمہارے نانا یوسف الدین، مہدی بلگرامی وغیرہ تک کو نہ چھوڑا، مولوی یوسف الدین اس زمانہ میں فراشن مشہور ہو گئے تھے ایک دفعہ سرِ بازار انکی نقل اتار دی وہ بیٹھے دیکھا کئے دانت پیس کر رہ گئے، کیا کرتے مجبور تھے۔ ان لوگوں کے ہاتھ سے کون بچا ہے جس کو چاہتے بدنام کر دیتے مگر بھئی تھے باکمال لوگ، میاں! وہ نعل صاحب کی سواری کس دھوم سے نکلتی تھی سارا راستہ بھر جاتا تھا جدھر دیکھو ڈیوٹیاں (مشعلیں) ہر طرف "دولہا یا علی" کی دھوم تل دھرنے جگہ نہ ملتی تھی کھوے سے کھوا ملکہ ناک سے ناک رگڑے کھاتی تھی، وہ دھوم دھام اب خواب و خیال ہی ہو گئی۔ ندی کا میلہ شہادت کے روز کیسے دھوم سے ہوتا تھا علم کا جلوس کتنا شاندار ہوتا تھا۔ بہشتی پانی چھڑکتے ہوئے جاتے تھے، ملنی مشکیں چھڑواتے رہتے خوش اعتقاد سڑک پر عود گار ڈھتے جاتے سبیل ہر جگہ لگی رہتی پانی کے بجائے دودھ کے شربت پلائے جاتے، ہائے وہ ماہی مراتب وہ علم مبارک کا ہاتھی آنسو بہاتے ہوئے گردن ڈالے کس غمگینی کیساتھ چلتا تھا علم پر ڈھیوں کی کثرت، عود بتیوں، وغیرہ کی بوچھاڑ، بیچارہ علمبردار ادھ موا ہی تو ہو جاتا کیسے کیسے تعزیے ساتھ ہوتے واللہ کس کمال سے بنائے جاتے تھے۔ ندی پر دیکھنے کی دھوم ہوتی تھی، حضور پرانی حویلی پر سے ڈھٹی

مرحمت فرماتے تھے بعض دفعہ تو تدی پر بھی رونق افروز ہو جاتے تھے، ندی کا میلہ تو اب بھی ہوتا ہے۔ مگر وہ بات کہاں؟

اس زمانہ میں کیسے کیسے لوگ تھے سدی مبروک استاد چنگاری، یاقوت عیسیٰ، بنگش، کیسے کیسے پھکیت لکڑی باز تھے حضور تو مبروک کی پھیک پھروں ملاحظہ فرماتے، اشرفیوں کے توڑوں کے توڑے مرحمت فرماتے!

محرم کے سوانگ تو بس نام کو رہ گئے اب شیر تو نظر ہی نہیں آتے، کیسے کیسے جوان شیر بنتے تھے اجی چیل سینڈ (ناگ پھنی) کی بھری بنڈی میں شیر سوتا ہوا جاتا تھا بعض شیروں کو تو ہم نے اپنی آنکھوں سے بکرے کا گلا چیر کر خون پیتے دیکھا ہے! وہ ہوا ہی بدل گئی۔ شیر، ریچھ، املک ڈھمک، کتنے سوانگ ہوتے تھے بے گنتی! مال والوں کی پتلیاں، مہاراجہ کی ڈیوڑھی کی پتلیاں ابن صاحب کا آبدارخانہ حضرت عباس کی درگاہ، بی بی کا الاوہ، بادشاہی عاشور خانہ، حسینی علم، یہ دیکھنے کی چیزیں ہوتی تھیں، ہم لوگ دو دو تین تین رات تک ان مقامات کی سیر کرتے تھے، مگر جی نہ بھرتا تھا۔

مجلسیں کتنی دھوم سے ہوتی تھیں، رشید آتے تھے، دولہا آتے تھے میاں منجھو بھی رہتے وہ بھی کیا سماں تھا؟ سارے شہر میں ٹکڑیاں ٹولیاں تھیں ایک محلہ کی ٹکڑی دوسرے محلہ کے خلاف، وہ لکڑی چلتی وہ عر بھٹول ہوتا کہ الامان الحفیظ، خوب لکڑی چلتی تلوار تک نوبت پہونچتی، سال بھر کی عداوت

محرم میں نکل جاتی تھی، سینکڑوں مرتے ہزاروں ہاتھ پاؤں، آنکھ ناک کھو کر برے حالوں جیتے، بچوں میں تک یہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اپنے محلہ میں کوئی دوسرے محلہ کا لڑکا آجاتا تو اس سے "نالہ بھرواتے"۔ میاں وہ باتیں خواب و خیال ہو گئیں، کسی نئے آدمی سے کہو تو سن کر ہنسے گا۔ نہ اب وہ جوش ہے اور نہ وہ دل وہ دماغ ہی نہیں وہ چونچلا ہی نہ رہا۔ دکھنی پٹھان مشہور تھے کیسے آن بان والے بات بات پر کٹ مرنے تیار، کوئی سامنے سے تنتنا ہوا نکل تو جائے بس وہیں ڈھیر کر دیا۔ بڑے میر صاحب اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما چکے تھے کہ ایک روز پانچ بجے ایک خان صاحب اپنے گھر کے بالا خانے پر بیٹھے ہوئے تھے سامنے سے ایک شامت زدہ مونچھیں چڑھاتا ہو گزرا، بس خانصاحب آپے سے باہر ہو گئے تلوار سنبھال کر بالاخانے سے کود ہی تو پڑے اور پھر اس بانکے نوجوان کو مخاطب کر کے فرمایا میاں ہم بھی سپاہی ہیں۔ بنیئے بقال نہیں تم نے کیا سمجھ کر ہمارے آگے مونچھیں چڑھائیں۔ وہ بیچارہ حیران ہو کر سب کچھ سنتا رہا آخر وہ بھی سپاہی تھا کہنے لگا۔ حضرت میں نے آپ کو دیکھ کر مونچھیں نہیں چڑھائی تھیں۔ مگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو میں اب چڑھاتا ہوں آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ ہم بھی تو سپاہی ہیں کوئی چمار نہیں، بس خانصاحب کا برا حال ہو گیا۔ اس نوجوان کی گردن پکڑ کر ایسا جھنجھوڑا کہ دس ہی منٹ میں غریب کا دم نکل گیا آپ نے غریب کی نعش کو ٹھکرا کر فرمایا دیکھا مردوں کے آگے مونچھیں چڑھانے کا مزا۔

ایسے لوگ اب کہاں پیدا ہوتے ہیں انہیں کی نسل اب بھی باقی ہے مگر پڑھ لکھکر سب بزدل ہو گئے ہاتھ اٹھاتے ہیں تو ضابطہ دیوانی کا خیال رکھ کر پاؤں بڑھاتے ہیں تو فوجداری کے دفعات کو دیکھکر گھر سے نکلنے سے پہلے سوچ لیتے ہیں کہ ان کا باہر نکلنا قابلِ دست اندازی پولس تو نہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے سے آدمی ناکارہ بزدل ضرور ہو جاتا ہے، یہی دیکھو نا تمہارے دادا ناظم دیوانی بلدہ تھے انہیں حکم ہوا کہ امتحان دیں، یہ حکم بہت ناگوار گذرا کچھ سوچکر خاموش ہو گئے چند روز کے بعد امتحان دیا اور کامیاب ہوے کامیابی کی اطلاع ملتے ہی استعفٰی دیدیا فرماتے تھے کہ ہم نے عدالت کا کام کرتے کرتے عمر گذاری اب ہم سے امتحان کو کہا جا رہا ہے گویا ہم کچھ جانتے نہیں ہمارا ارادہ تو حکم ملتے ہی ملازمت چھوڑ دینے کا تھا مگر یہ خیال ہوا کہ کہیں یہ نہ کہیں کہ امتحان میں ناکامیاب رہنے کے خوف سے ملازمت چھوڑ دی، ہم نے امتحان دیا اور پھر استعفٰی"! اب دیکھو انہیں نواب سعادت علیخاں بہادر کے صاحبزادے تمہارے والد تھے انہوں نے کئی ایک امتحان دیئے جس کے باپ نے امتحان کو ذلت خیال کیا تھا، اس کا بیٹا عزت تصور کرنے لگا۔ اب تم ہو کہ تمہیں بھی امتحانوں کی دھن سوار ہے کہو تم لوگ پڑھ کر بزدل ہو گئے یا نہیں، پرانے لوگ، قرآن شریف، چند حدیثیں چند تفسیریں کچھ منطق کی عربی کتابیں تھوڑی سی فارسی پڑھ لیتے تھے اور بس یہی وجہ تھی جو وہ عزت، خودداری، وقار تمکنت، وضع داری پر جان تک دیدینے تیار ہو جاتے

تم لوگ فلسفہ، سائنس، حساب، معاشیات، سیاسیات، الہیات، بلبیات، کیا اور کیا پڑھکر تمام چیزیں کھو بیٹھے ہو، گالی سنتے ہو تو گالی کے فلسفہ پر بحث کرنے لگتے ہو۔ عزت کا خیال نہیں کرتے، مار پڑتی ہے تو سائنس کے نقطۂ نظر سے اس کو دیکھتے ہو اسکی علتِ غائی سمجھنے لگتے ہو، خودداری کو نزدیک آنے نہیں دیتے۔ اسی طرح تم لوگوں نے ساری چیزوں کو بھلا دیا ہے، مذہب کا تو نام ہی نام رہ گیا۔ عید کی نماز بھی تمہیں ناگوار ہے، خدا کے احکام پر ہنسنا، رسول کے احکام کا مضحکہ اڑانا، آئمہ کے اقوال پر قہقہہ لگانا، بزرگوں کے افعال کو بے وقوفی ٹھیرانا تم لوگوں کی عادت ہو گئی ہے۔ لے دیکھئے تمہارے پاس مذہب صرف ترکی ٹوپی کی حد تک رہ گیا ہے وہ بھی جاڑے اور برسات میں کیونکہ گرما میں تو تم لوگ کوٹ پتلون کے ساتھ دھوپ کی انگریزی ٹوپی استعمال کرتے ہو اس کے بعد البتہ بعض بعض وقت ترکی ٹوپی تم لوگوں کے سر پر نظر آتی ہے۔ ملک، قوم، وطن، جیسے ثقیل اور بے معنی الفاظ تم لوگوں کا تکیہ کلام ہیں، ملک کیلئے ایک پیسہ جیب سے نہ نکلیگا، قوم کیلئے گھر سے چار مینار تک جانا نہ ہوگا۔ وطن کیلئے ناخن کٹوانے کے بھی روادار نہیں۔ مذہب سے اسقدر ہمدردی رہ گئی ہے کہ بس شریف گھرانے کی بیواؤں کا نکاح ثانی کرالے اور پردہ اٹھا کر لوگوں کی بہو بیٹیوں کو بے پردہ بنانے کی فکر میں رہتے ہو! ہائے میاں بُرا نہ ماننا دل جلتا کلیجے میں آگ لگجاتی ہے، خون کھولنے لگتا ہے، اُف زمانہ دیکھتے دیکھتے کیسا بدل گیا پہلے کے لوگ اپنے بزرگوں سے ملنے والوں یا اپنے سے بڑی عمر والوں کا

اتنا ادب کرتے تھے کہ ان کے آگے کھانستے کھنکارتے تک نہ تھے ہاتھ باندھے یا
دو زانو مودب بیٹھا کرتے تھے اب تم ہی دیکھو میرے سامنے تم کسقدر بے تکلف ہیں
سے بیٹھے ہوئے ہو سگریٹ پر سگریٹ جلا رہے ہو ہائے ادب قاعدہ، تہذیب تو ایک کو
اٹھ گئی۔ اس کے بجائے بے حیائی کے پردے لوگوں کی آنکھوں پر پڑ گئے عینک کر
عبرت!! ہم پرسوں شیخ جی کے پاس سکندر آباد چلے گئے ان کہنے ہم سے قصور ہو گیا
آج ایک مشہور کھیل ہے ہم نے کہا جہاں اتنے شیطانی کھیل اور اپنا راستہ لیا ہمکو
اور سہی ہم بھی ان کے ساتھ وہاں کے فتح میدان ہیں ہمارے زمانہ کے کھیل کیا
تل دھرنے جگہ نہ تھی ہم نے گھس پٹ کر آخر پہلو ہو جائیں تو سنکڑوں کو بھگا دیں،
کیا ہیں کہ دو طرف تین تین پتلی پتلی کھونٹیاں یوں کو اس فن کی تعلیم دیجاتی تھی مگر
ہیں ایک طرف سے ایک آدمی دوڑتا ان کے ساتھ ٹینس کھیلتی ہے ٹینس!

اور دوسری طرف سے ایک چھوٹے سے کرخاکی قمیص پہنے سر پر انگریزی ٹوپی اوڑھے
دوڑ شروع ہوتی ہے ادھر سے مدرسہ کے بچے میلے کچیلے عرض جاتا رہا ہیں اکثر
ہیں جیسے دیکھ کر لوگ چیختے چلائے یہ اسکاؤٹ ہیں چاہے اسکاونٹ ہوں یا اسکے
ہیں یہ بھی کوئی کھیل ہے کھیل ہم نے پان چباتے ہوئے سگریٹ جلا کر تماشہ بنی
کھیلی ہے، تلوار پھیکی ہے لکڑی چلائی بعضوں کے ہاتھ میں ان کے قد سے اونچا
چیر کی بلہ۔ لونڈ پاٹ، جھاڑ منڈ رہا" بد اتنا تک جانتے ہیں بھلا لکڑی کیا چلائنگے؟
ہوتے تھے۔ لونڈ پاٹ میں ہمارے آوارہ بنانے کی پہلی سیڑھی ہے والدین میلے

ہمارا مقابلہ کوئی نہ کرتا تھا۔ پتلے سے پتلے درخت کی چوٹی پر پہونچ جاتے تھے،
کیا سچی ایسا کھیلا کہ سب لوگ مان گئے اجی آدھ گھنٹہ پانی میں ڈوبے رہتے تھے
لگتے تال میں چھپتا تو اسے بھی نکال لاتے تھے واللہ ہم نے کیا کیا نہیں کیا مگر ایسے
دیکھتے کھیل ہم نے نہیں کھیلے، شطرنج، چوسر، پچیسی، ڈومنا، گنجفہ، تاش، داما،
اسی طرح ہم ہم نے کھیلے ہیں تمہارے والد کے ماموں جیلانی صاحب مرحوم مشہور
رہ گیا۔ عید کی نماز بھی رہتے تھے دالان میں بساط بچھی رہتی مخالف چال چلتا آپ اندر
مضحکہ اڑانا آئمہ کے اقوال پڑھ کہتے رہتے اور پھر تین چار چال میں مات ہو جاتی تھی
عادت ہو گئی ہے۔ لے دیکھے تمہار نہیں کئی بار مات دی ہے۔ سید صاحب کی گلی میں
وہ بھی جاڑے اور برسات میں کیونکہ گرما سی کی دھوم تھی ایک مرتبہ ہم نے ان سے بھی
کی انگریزی ٹوپی استعمال کرتے ہو اس کے پاس آکر کھیلا کرتے تھے۔ بہر حال دنیا کا
لوگوں کے سر پر نظر آتی ہے۔ ملک، قوم، وطن ہے تھے کہ ان سے فائدہ بھی پہونچتا تھا
تکیہ کلام ہیں، ملک کیلئے ایک پیسہ جیب سے نہ نکلے گا نگر کے پہاڑوں میں کوئی بزرگ
جانا نہ ہوگا۔ وطن کیلئے ناخن کٹوانے کے بھی روادار نہ تھے، واپسی میں شام ہو گئی
رہ گئی ہے کہ بس شریف گھرانے کی بیواؤں کا نکاح لہ چار ڈھاٹا باندھ چور لاٹھی لکڑیاں
لوگوں کی بہو بیٹیوں کو بے پردہ بنانے کی فکر میں زمانہ میں ہم ہاتھ میں لکڑی بھی نہیں
دل جلتا کلیجے میں آگ لگ جاتی ہے، خون کھولنے لگتا۔ اتار انگرکھے کے جیب سے چار موٹے
کیسا بدل گیا پہلے کے لوگ اپنے بزرگوں سے میں باندھ لئے اور رومال کو بل دیکر مقابلے

مقابلہ کیلئے تیار ہوگئے چار و ڈاکوؤں نے ہم پر حملہ کیا ہم نے رومال ہلانا شروع کیا پہلے ہی مار میں ایک چور کا گھٹنا بیکار کر دیا وہ لنگا کر کر اپنے دوسرے مار میں دوسرے کے دونوں ہاتھ پہونچوں سے اتار دیئے وہ غریب تو فرار ہوگیا ایک کو ہم نے پیٹھ پر ایسی ضرب لگائی کہ زمین پر لوٹنے لگا چوتھے نے لکڑی پھینک کر ہمارے پاؤں پکڑ لئے کہنے لگا میر صاحب خدا کیلئے معاف فرمائیے ہم سے قصور ہو گیا ہم نے عاجز کو مارنا خلافِ انسانیت سمجھ کر اسے چھوڑ دیا اور اپنا راستہ لیا ہمکو اِن کھیلوں سے ایسے ایسے فائدے پہونچے یہ تمہارے زمانہ کے کھیل کیا فائدہ دیں گے؟ ابھی ہم لکڑی لیکر کھڑے ہوجائیں تو سینکڑوں کو بھگا دیں، کھیل کے کھیل ہنر کے ہنر ہیں، پہلے شریفوں کو اس فن کی تعلیم دیجاتی تھی مگر ہائے اب تو شریفوں کی اولاد عورتوں کے ساتھ ٹینس کھیلتی ہے ٹینس!

وہ خاکی چڈیاں (نکر) اور خاکی قمیص پہنے سر پر انگریزی ٹوپی اوڑھے کمر میں رسی لٹکائے چھوٹے چھوٹے مدرسہ کے بچے میلے ٹھیلے عرس جاترا میں اکثر نظر آتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اسکاوٹ ہیں چاہے اسکاونٹ ہوں یا اسکے ہونٹ ہوں مگر کس کام کے۔ سوائے پان چباتے ہوئے سگریٹ جلا کر تماش بینی کرنے کے یہ لڑکے کرہی کیا سکتے ہیں بعضوں کے ہاتھ میں ان کے قد سے اونچا بانس بھی ہوتا ہے۔ بیچارے "پٹیرا" بد انا تک جانتے نہیں بھلا لکڑی کیا چلائینگے؟ اور پھر وہ بھی بانس، یہ لڑکوں کو آوارہ بنانے کی پہلی سیڑھی ہے والدین میلے

ٹھیلے میں جانے کی خوشی سے اجازت دیتے ہیں مدرسے سے رخصت ملجاتی ہے نگرانی کرنیوالا کوئی ہوتا نہیں، چلو جو جی میں آیا کیا، کیا میاں اسی منہ پر تہذیب سکھانے، مہذب بنانے کا وعدہ ہے۔ تہذیب اسی طرح سکھائی جاتی ہے اگلا پچھلا حصہ کھلا ہے اور چلے جا رہے ہیں۔ مٹکتے تھرکتے، گورا گورا رنگ بھرا بھرا جسم، پھر چست لباس، ستر عورت (گھٹنے) نظر آتے ہوئے انہیں دیکھکر بے تحاشا جی میں آتا ہے کہ یہ کہدیں۔

اے تماشا گاہ عالم روئے تو   تو چرا بہر تماشا می روی

اور پھر دل لگی یہ کہ بیچارے دوسروں کی مدد کرنے یا دوسرے معنی میں خود تماشا دیکھنے جاتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ بقول شخصے

تماشہ بن گئے خود ہی تماشا دیکھنے والے

وہ خود تماشا بن جاتے ہیں، یہیں سے ان کے اخلاق بگڑنے لگتے ہیں۔ علت ہشائخاں پیدا ہونے لگتی ہے کیا جدید تہذیب اسی کا نام ہے پرانی روش کو چھوڑ کر تم لوگوں نے جو ترقی کی وہ یہی ہے اپنی اولاد کو اسیطرح تربیت کرتے ہیں؟ ہائے خدا کی قسم!

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی   کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

لاحول ولا کدھر محرم کہاں وہ اکھاڑے اور کدھر یہ تمہاری جدید تہذیب میں بھی کہاں سے کہاں پہونچ گیا بھائی بات یہ ہے افکار نے دماغ کو

ضعیف کر دیا ہے ایک وہ زمانہ تھا کہ ہمارے حافظہ کی دھوم تھی، کروڑوں شعر یاد تھے۔ بیت بازی میں ہمارے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا ایسے شعر جنکے آخر میں د، ڈ، ر، س، ش، وغیرہ ہوں ہمیں ہزاروں یاد تھے ذوق۔ سودا میر، انشا، نصیر، مومن، کی غزلیں، نوکِ زبان تھیں! بات یہ ہے کہ وہ صحبتیں بھی ایسی ہی تھیں، غلام حسین داد مرحوم، کیفی مرحوم، تمہارے والد تجلی مرحوم مست، مہکش، تراب علی روز، استادِ داغ، ترکی وغیرہ کا مجمع تھا رات دن انہیں لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا، مرحوم داد کی بذلہ سنجی، کیفی کی لطیفہ گوئی، تجلی کی حاضر جوابی، مست کا چوچلا، مہکش کی رندی، زور کی تاریخیں، استادِ داغ کا روزمرہ، ترکی کا پھکڑپن قابل دید تھا۔ ہائے کیا صحبت تھی، کیفی کا یہ حال تھا کہ منٹ بھر نچلا نہ بیٹھا جاتا تھا، چلتے چلتے غزل کہدی بیٹھے بیٹھے قصیدہ کہہ ڈالا بڑے سے بڑے استاد کو مشاعرہ میں ٹوک دیا، آدمی کیا آفت تھا، معلومات کا یہ حال تھا کہ ایک دریا تھا دریا۔ تجلی، متانت، ثقاہت سنجیدگی میں بالکل کیفی کا جواب تھا، کیفی رندانہ مزاج تو یہ صوفی منش مگر تھی دونوں میں بڑی دوستی! مست تو بس مستِ الست ہی تھا کیا کہوں کیسی طبیعت پائی تھی دنیا بھر کی شرارتیں ظالم میں موجود ہر جھگڑے ہر فساد ہر بکھیڑے کا بانی یہی ہوتا تھا چاہے وہ جو کچھ کر گذرے بھلا ہو یا برا یہ سب لوگ اس کا ساتھ دیتے کیفی نے تو خصوصیت سے اس کا ساتھ دیا ہر معاملہ میں سینہ سپر نظر آتا تھا

بھائی دوست ہوں تو ایسے ہوں! داد کا کیا پوچھنا بلا کا پُرگو غضب کا منسوڑیہ دو دو پیسے والی چھوٹی چھوٹی نظموں کے چھپوانے کا طریقہ اسی ظالم نے رائج کیا عجیب آدمی تھا بیکلش ان سب کے پیرِ مغاں تھے مگر سب کے ساتھ! زور کی منہ زوری کیا کہوں کس کی مجال تھی کہ مشاعرے میں داد نہ دے! بھئی تاریخ گوئی میں کامل بلکہ اکمل تھا اب ایسا تاریخ گو کوئی نہیں رہا۔ استادِ داغ کا کیا پوچھنا بلبلِ ہندوستان تھا وہ روزمرہ، وہ سلاست، وہ زباں، وہ مضامین واقعہ یہ ہے کہ خدائے سخن تھا، اس پر سخنوری ختم ہوگئی، تَر کی فارسی کا استاد تھا مگر اُردو میں بھی کچھ کم نہ تھا کسی کو خاطر میں تھوڑا ہی لاتا تھا کہتا ہے سے

اچھا ہوا کہ پہلے ہی مجھ سے گذر گئے　　سعدی و انوری و دقیقی و رودکی
ورنہ دکھا کے رنگِ طرازِ سخن انہیں　　کچھ ٹوٹی پھوٹی انکی بھی سُن لیتا پارسی

ہر ایک اپنے اپنے وقت کا استاد تھا۔ اللہ اللہ کیسی صحبتیں تھیں، کیا زمانہ تھا یہ لوگ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ شاعر گر بھی تھے انکی صحبت میں ہزار ول شاعر، ادیب عالم فاضل ہو گئے۔

تم صرف محرم کو یاد کرتے ہو اجی عرس میلے جھگڑے، مینا بازار، جاترا، جشن ہر چیز مستقل تھی، مولا کا عرس، بابا شرف الدینؒ کا عرس، امام ضامن کا عرس، خواجہ کے چلہ کا عرس، تمام درگاہوں کے جھگڑے، الوال، گلشن باغ وغیرہ کی جاترا نواب حفیظ اللہ خاں کے پاس کا جشن، کیسی دلچسپیاں تھیں جھگڑوں میں کیسی

کیسی صورتیں نظر آتی تھیں، تمہارے والدِ مرحوم نے ایک جھگڑے ہی میں نہیں یہ مطلع سنایا تھا ؎

نظر پڑتی ہے جب میری کسی کی اچھی صورت پر
تو ہوتا ہوں میں صدقے صانعِ قدرت کی صنعت پر

شاید کیفی مرحوم نے بھی ۔ ع

توڑے رے توڑے میرے پاؤں کے پائل توڑے

والی غزل جھگڑے ہی میں کہی تھی رسوا[1] صاحب کی مشہور "چولی کے بند" والی غزل بھی انہیں جھگڑوں کی یادگار ہے

ہولی دیوالی بھی خاص تھی اسوقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر اتفاق تھا دیوالی میں تمام ہندوؤں کی دوکانیں مسلماں دوستوں سے بھری رہتی تھیں ایک دوسرے سے کیسے برادرانہ طریقے سے ملتے ۔ درد دکھ رنج وغم کے شریک تھے میاں ابتک بھی کچھ اتفاق حیدرآباد میں باقی ہے یہاں سے باہر جائیے تو معلوم ہوگا کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے دشمن ہیں دشمن ! خدا حیدرآباد میں اس اتحاد کو قائم رکھے ۔

میر صاحب نے تہذیب و تمدن سیاست، مذہب غرض ہر چیز پر اظہار خیال فرمایا انکی تقریر اس قدر دلچسپ اور لچھے دار ہوتی ہے کہ ختم ہونیکا نام ہی

[1] حضرت مولوی میرزا غلام مصطفےٰ رسا

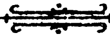
نہیں آتا۔ بہ دقت تمام ہم نے دوسری گفتگو چھیڑی۔ کچھ انکی صحت کے متعلق کچھ گھر کے متعلق کچھ بچوں کی مزاج پرسی مگر اس موضوع پر بھی ایک ایک مستقل لکچر بڑی زور کا سنایا، آخر میں نلوں کے پانی کی وجہ ملیریا اور الکٹرک کی وجہ طاعون کے رہنے کا رونا بھی روتے رہے سلطان شاہی کے مکان کے آرایش بلدہ میں جانیکا ذکر کیا تو دیر تک اس محلہ کی ویرانی کا تذکرہ اور آرایش بلدہ کی صنعت وغیرہ بیان فرمایا، بچوں پر تو بس برس ہی پڑے۔ نافرمانی، تعلیم سے عدم دلچسپی بے ادبی، گستاخی پر نہایت ہی فاضلانہ خیالات کا اظہار فرمایا اسی مصروفیت میں تین بجگئے۔ ہماری آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ میر صاحب کے ساتھ کھانا کھائیں مگر پھر اس خوف سے کہ شام تک میر صاحب کی مسلسل تقریر کے مزے لینا پڑے گا ہم نے جمائیاں لینی شروع کیں بارے میر صاحب بھی کچھ سمجھ گئے اجازت چاہی تو بزرگوں کی روایت اور اپنی محبت کا اظہار فرما کر ملتے رہنے کی نصیحت اور گھر پر آنے کی ہدایت فرمائی اور ساڑھے تین بجے تشریف لیگئے۔

مولوی سردار علی صاحب نے مضمون کیلئے فرمایا تھا ہم نے دوسرے دن مضمون دینے کا وعدہ بھی کر لیا تھا میر صاحب سدّ راہ نہ ہوتے ہم کتبخانہ آصفیہ پہنچکر کچھ میٹیریل لا لیتے مگر انہوں نے نہ صرف وقت خراب کیا بلکہ دماغ کو بھی تقریباً ایک ہفتہ کیلئے رخصت اتفاقی دیدی ہم نے کہا کہ دوسرا کوئی

کام تو ہو نہیں سکتا میر صاحب کی ملاقات اور اُونکی گفتگو کا مختصر حال ہی لکھ لیں یہ ہے اس بکواس کی شانِ نزول! یہ صرف بکواس ہی بکواس نہیں ذرا غور کے قابل بھی چیز ہے۔

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند (اقبال)

اللہ بس



میرزا صاحب

مرزا صاحب خدا رکھے ہیں بڑے خلیق آدمی، بینائی میں فرق آگیا ہے کان بھی جواب دے رہے ہیں۔ قوت بھی گھٹ گئی ہے مگر کیا مجال جو حضرت کے معمول میں فرق آئے وہی صبح دس بجے سے خانہ شماری شروع کی تو بس ایک بجادیا اور پھر چھ بجے گھر سے نکلے تو واپسی کا نام نہیں، کبھی آٹھ نو بجے گھر لوٹے تو کبھی بارہ بجے اور کبھی رات بھر غائب، تمام شہر کی خاک چھان لینگے ہر ایک دوست سے ملیں گے امکانی ہمدردی کرینگے تب کہیں چین آتا ہے

دبلے پتلے تیر کی طرح سیدھے آدمی متوسط قد، گھٹا ہوا سر، خشخاشی ڈاڑھی جس کے بال آدھے سے زیادہ سفید، بل کھائی ہوئی مونچھیں، سرمہ آلود آنکھیں، سیاہ شملہ، باریک کپڑے کی ملگجی شیروانی، ہرک کا چست پاجامہ دلی کا سادہ جوتا۔ ہاتھ میں پتلی سی بنوٹ کی لکڑی شام لگی ہوئی سیدھے ہاتھ کی انگلی میں آخری چہار شنبہ کا چھلّا الٹے ہاتھ میں فیروزہ کی انگوٹھی اور مضراب، کندھے پر

رومال جیب میں پان کا بٹوا ایک تھیلی میں شطرنج کے مہرے اور کاغذ۔
رکاب سعادت کے منصبدار سوائے دوست احباب کے اور کسی کی فکر
نہیں صبح ہوئی اور آپ اوٹھ بیٹھے ضروریات سے فارغ ہوئے چاء پی اور
دیوان خانہ میں آ بیٹھے کوئی آ گیا تو بساط بچھ گئی ورنہ ستار بجانے لگے ساڑھے نو بجے
کھانا کھایا اور بٹوے میں پان بھر کر چلے۔ حضرت کے ملنے والے بھی خدا کے فضل
سے اکثر نہیں کے جیسے بے فکرے۔ کسی کے پاس تھوڑی دیر ستار بجاتے رہے۔
کہیں ایک دو بازیاں شطرنج کی ہو گئیں۔ کسی جگہ گنجفہ اڑا۔ شطرنج کا شوق نہیں بلکہ
جنوں ہے اب تو شاید کچھ کمی ہے مگر ایک زمانہ میں سنتے ہیں کہ "جوش" تھا اس
"جوشِ جنون" کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ حضرت میرزا صاحب کے کوئی عزیز بیمار تھے
اور برا حال تھا صبح صبح شیشہ لیکر نکلے حکیم صاحب سے ملاقات کی مریض کا حال کہا
دوا لی اور واپس چلے۔ راستہ میں ایک دوست نے کہا کہ بھئی میرزا آؤ ایک بات
ہو جائے۔ بس میرزا صاحب بیٹھ گئے بارہ بج گئے مگر انہیں خبر نہ ہوئی ادہر قریب المرگ
بیمار نے تاب انتظار نہ لا کر داعی اجل کو لبیک بھی کہدیا۔ مگر میرزا صاحب کی بازی
ختم نہ ہوئی دوا لئے بیٹھے رہے ایک لڑکے نے آ کر موت کی اطلاع دی اور میرزا صاحب
پریشان ہو کر اوٹھ کھڑے ہوئے مگر مد مقابل کے یہ کہنے پر کہ میرزا مات ہماری تھی
تمہارا فرزین تو پھنس گیا، پھر بیٹھ گئے اور لگے کھیلنے ادہر لوگوں نے میت کی
تجہیز و تکفین کی اور عصر کی نماز کے وقت جنازہ مسجد کو پہونچا جب ایک شخص نے

سب جھوٹ ہے ... پرکی گھر میں ...
باہر ... ...

میرزا صاحب کو اسکی اطلاع دی تو ادھوری بازی چھوڑ کر مجبوراً مسجد جا پہونچے۔

اس قصہ کی واقعیت میں شک نہیں اس لئے کہ جب کبھی ہم نے اس قصہ کے متعلق میرزا صاحب سے کچھ پوچھا تو انہوں نے، بھئی لوگ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں کہکر خاموشی اختیار کی، اگر اصلیت نہ ہوتی تو وہ ضرور تردید کر دیتے۔

محرم کی دسویں تاریخ اتفاق سے میرزا صاحب مل گئے۔ سیاہ شیروانی گلے کی گھنڈیاں کھلی ہوئیں، شملہ ندارد، کھلے سر، پاجامہ کے پائنچے چڑھے ہوئے برہنہ پا بغل میں سونے کے قبضہ کی عباسی (تلوار) سیدھے ہاتھ میں خاک شفا کی تسبیح، ہونٹ منہ خشک، چہرا اترا ہوا، منہ میں پان نہ آنکھوں میں سرمہ، پہلے تو ہم میرزا صاحب کو دیکھ کر چکرائے مگر پھر شہادت کے روز کا خیال آگیا تو ہم نے "جل تو جلال تو" کا ورد شروع کیا ڈرتا تھا کہ کہیں ہم کو ٹوپی اور جوتا پہنے ہوئے دیکھ کر حضرت بگڑ نہ جائیں مگر خیر یہ گذری کہ صرف علیک سلیک پر بلا ٹلی البتہ جاتے جاتے میرزا صاحب نے پرسوں ذرا مل لینا، فرما دیا۔

میرزا صاحب کے پھکڑپن سے ہماری روح ہی فنا ہوتی ہے ہم نے سوچا کہ میرزا صاحب سے نہ ملیں تو پھر قیامت آجائیگی۔ راستہ میں جہاں کہیں ملاقات ہوگی حضرت لتے لے ڈالینگے وہ وہ بے نقط سنائینگے کہ توبہ، سنگ آمد وسخت آمد کہکر پہونچ ہی گئے میرزا صاحب دیوانخانے میں بیٹھے ایک صاحب کو منہ پھٹ کے کچھ زبانی گر بتا رہے تھے ایک شخص کو موجودہ پاکر مسرت ہوئی کہ چلو اسی غیبت سے

میرزا صاحب کو جھک جھک کرتے دو ہم تھوڑی دیر بیٹھکر چلے آئینگے مگر ہمارا بیٹھنا ہی تھا کہ میرزا صاحب نے اپنا لکچر ختم کر دیا اور متوجہ ہو گئے ہماری طرف، رسمی گفتگو کے بعد ستار ہارمونیم کا موازنہ شروع کیا اور دیر تک اس پر روشنی ڈالتے رہے پھر سُرودفنٹل، سے لیکر مضمار، جلترنگ اور بالسن تک کے بجانے کے طریقے اور اس فن شریف کے اساتذہ کے اسماء گرامی معہ مختصر حاشیہ کے سناتے رہے، وہ غریب جو پہلے سے بیٹھا ہوا میرزا صاحب سے گفتگو کر رہا تھا یہ دیکھکر کہ میرزا صاحب ہم سے نہایت ہی انہماک سے گفتگو کر رہے ہیں چلتا بنا، اب صرف ہیں ہم تھے دیر تک یہی گفتگو ہوتی رہی، آخر ہم نے عرض کیا، قبلہ! ہمیں کیوں یاد فرمایا تھا کہنے لگے، میاں بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ملنے والے سب مر مٹے، دیکھو نا، کیفی نہ رہے، ہست نے داروئے اجل پی لی، قطب الدین مدت ہوئی مر گئے، لے دیکے ایک تمہارے والد رہ گئے تھے مگر آخر وقت میں انہوں نے بھی ہم سے کنارہ کر لیا قبل از وقت داغ دیگئے اب ایک خمک کی کنکری تجو میاں رہ گئے ہیں مگر ان کا حال ہم سے بُرا ہے آنکھیں ہم سے زیادہ خراب ہو گئیں قوۃ تو بالکل نہ رہی گھٹنوں کے درد نے بیچاروں کو معذور کر دیا ہم کو جب کبھی کسی معاملہ میں صلاح مشورہ کرنے کی ضرورت ہوتی تو انہیں لوگوں سے رائے لیتے بھئی یہ لوگ تھے بھی بڑے قابل بڑی دوراندیشی سے ہر ایک بات پر غور کر کے رائے دیتے ان لوگوں کا جانشین کوئی نہ رہا پرسوں تم نظر آئے تو ہم نے کہا چلو تمہیں سے کچھ مشورہ کریں بات

دراصل یہ ہے کہ خدا سلامت رکھے حضور کو ہماری آسایش کا ہر طرح سے انتظام فرما رہے ہیں دیکھو نا یہ آئے دن کے "طاعون" اور انفلوئنزا (انفلوئنزا) میعادی بخار وغیرہ میں ہم لوگوں کو مبتلا دیکھ کر حضور نے پختہ موریاں بنوانے کا حکم صادر فرما دیا محلے وسیع ہو رہے ہیں جگہ جگہ چمن بندی ہو رہی ہے سرکاری مکانات بن رہے ہیں دوکانوں کیلئے سائبان تیار ہو رہے ہیں۔ دیکھو کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے یہی حیدرآباد جو آج کل دلہن کی طرح سجا سجایا نظر آرہا ہے آج سے بیس اکیس سال پہلے بالکل برباد ہو چکا تھا ویران تھا جگہ جگہ مٹی کے ڈھیر خاک کے تودے بڑے بڑے غار نظر آتے تھے یہ کاہے کے تھے معلوم ہے؟ اجی اس منحوس ندی کی طغیانی کے غضب خدا کا آدھا شہر اجڑ گیا تھا۔ میاں تم چھوٹے تھے پانچ سات برس کی عمر ہوگی تمہیں تفصیل کیا معلوم ہم نے آنکھوں سے دیکھا ہے ا۔ یوں تو شہر میں کئی وقت طغیانیاں آئیں مرزا صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ۱۶۳۱ء میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں سب سے پہلی طغیانی آئی تھی بیچ شہر تک پانی آگیا تھا اس کے بعد ۱۷۶۸ء میں نواب میر نظام علیخاں کے زمانے میں بھی طغیانی ہوئی مگر ایسا زیادہ نقصان نہیں ہوا نواب ناصر الدولہ کے زمانہ میں ۱۸۳۱ء کا سیلاب خود بڑے میرزا صاحب نے دیکھا تھا وہ فرماتے تھے کہ وہ بھی عظیم الشان طغیانی تھی۔ گھانسی میاں کا بازار۔ سدی عنبر کا بازار بہہ گیا تھا ۱۹۰۳ء کی طغیانی ہم نے بھی دیکھی ہے اسوقت ہم جوان تھے مگر یہ کوئی بڑی طغیانی نہ تھی معمولی تھی قیامت تو بس

سنہ ۱۹۰۸ء میں آدھی وسط رمضان شریف تک حیدرآباد میں بارش نہ ہوئی تھی، لوگ چاہتے تھے کہ پانی برسے ۲۳، ۲۴ شعبان سے یکایک پانی برسنے لگا چند دنوں تک تو یونہی معمولی بارش ہوتی رہی مگر بعد میں زور بڑھ گیا غضب خدا کا ۲۶ گھنٹوں میں ۱۶ انچ بارش ہو گئی اس کثرت سے پانی پڑا کہ جل تھل ہو گیا ندی تالاب ایک ہو گئے ۲۸ شعبان کی رات کو یکایک پانی بڑھ گیا اور آبادی میں گھسنے لگا صبح تک مستعد پورہ۔ بیگم بازار۔ گھانسی میاں کا بازار امین باغ تمام پانی میں چھپ گئے تھے دوپہر تک کاروان، دھول پیٹھ، افضل گنج، بازار سدی عنبر، فیل خانہ، توپ خانہ، گوشہ محل، گول نگاہ، گولی گوڑہ، پتلیوں کی باؤلی، رسیڈنسی محی الدین پاشا کا باغ، جام باغ، کاچی گوڑہ بھی تہ آب تھا اور زور بڑھتا جارہا تھا تھوڑی دیر کے بعد کشن باغ، بہادر پورہ، چیتکنی پورہ، کبوتر خانہ، محبوب پورہ مہندی، اردو، چار محل، دار الشفا، عثمان پورہ بھی پانی میں تیرتا نظر آرہا تھا، وہ عمارتیں جو تا قیامت پائدار سمجھی جارہی تھیں حباب کی طرح بہ گئیں۔ بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھڑ گئے، غضب خدا کا بچاو جیسا عظیم الشان ہاتھی اجی ہاتھی کیا۔ پہاڑ سمجھو تنکے کی طرح بہ گیا، پرانا پل، مسلم پل، افضل گنج کا پل، چادر گھاٹ کا پل سبھی کاڑیوں کی ڈبیوں کی طرح بہ گئے افضل گنج کا دواخانہ بیماروں سمیت بہ گیا، عدالت العالیہ کی بنیاد ہل گئی۔ ٹھگی جیل کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ زچگی خانہ وکٹوریہ زنانہ ہاسپٹل معہ زچاؤں اور بچوں کے نہ جانے کس طرف بہ گیا فیاض علیخاں

کی کوٹھی کا پتہ بھی نہ رہا۔ وہ رسی ڈسنی کے اول مددگار کا بنگلہ ایسے معنوں میں آیا کہ پتہ نہ لگا۔ افضل گنج کا انگریزی ٹپہ خانہ رسی ڈسنی کا تار گھر بھی باڑہ گیا، اجی ایک دو ہو تو کہتے جائیں ندی کے دو طرفہ فقط خاک کا ڈھیر تھا یا بڑے بڑے غار اور کچھ نہیں سارا کاروان موسیٰ ندی کے قافلہ کے ساتھ جا چکا تھا محلہ کا پتہ نہ تھا، کوکہ کی ٹٹی معلوم نہیں کہ ہوا سے اڑی یا پانی سے بہی مگر نام و نشان تک باقی نہ تھا دھول پیٹھ میں واقعی دھول اڑ رہی تھی، پٹیلہ برج ساقط ہو چکا تھا کولسہ واڑی کی آگ ہمیشہ کیلئے بجھ چکی تھی، چنپا دروازہ پانی کے ڈنڈے سے گلّی کی طرح اڑ چکا تھا گلّی گوڑے کے باشندے بوکھلائے ہوئے اپنا گھر ڈھونڈھتے پھر رہے تھے مگر کوئی نشان باقی نہ تھا۔ چادر گھاٹ بھی نیست و نابود ہو چکا تھا، طغیانی کیا تھی خدا کا غضب تھا غضب قیامت تھی اُف منزائے اعمال کہوا ور کیا تھا ہائے کیسے کیسے گھر تباہ ہوگئے وہ امیر جو ہاتھی اور میانہ کے بغیر ڈیوڑھی سے نہ نکلے تھے تنہا بہ تقدیر سر پہ ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا بھاگا بھاگ اپنی جان بچا رہے تھے وہ خواتین جن کو کسی غیر محرم نے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا جو کبھی چوکھٹ سے باہر نہ ہوئی تھیں بغیر چادر کے چلی جا رہی تھیں آہ ماں بچے کو چھوڑ شوہر بیوی کو چھوڑ بیٹا ماں سے بچھڑ کر بیوی شوہر سے جدا ہو کر اپنی اپنی جان بچا رہے تھے ہائے کیا قیامت تھی بدنصیبوں نے اس پُر آشوب وقت میں بھی اپنی عادت نہیں چھوڑی چوریاں کیں، بدفعلیاں کیں بدمعاشیاں کیں۔ خدا سمجھے جو نہ کرنا کیا آہ کیا وقت تھا

مرحوم سرکار کو خداوند عالم کروٹ کروٹ جنت دے وہ انتظام کیا کہ واہ طغیانی کے روز سرکار پرانی حویلی میں رونق افروز تھے پانی جب بڑھنے لگا تو خانہ زادوں نے فلک نما پر تشریف لے چلنے کیلئے عرض کیا مگر سرکار کو اپنی عزیز رعایا کی تکلیف کا اس قدر احساس تھا کہ فرطِ رقت سے چشم پُرآب ہو کر انکار فرما دیتے تھے منٹ منٹ کی کیفیت سماعت فرماتے رہے طوفان فرو کرنیکی امکانی تدابیر اختیار فرمائیں مگر وہ کوئی حادثہ ہوتا تو رُکتا وہ تو ہم لوگوں کے اعمال کی سزا تھی۔ مگر حضور بے انتہا بے چین تھے صبح کو نواب افسر الملک کو طلب فرمایا وہ اپنی راحت منزل میں تھے مگر میاں سپاہی ہو تو ایسا ہو مالک کا حکم ملتے ہی گھوڑے پر چڑھ کر چلے تینوں پُل ٹوٹ چکے تھے چادر گھاٹ کا پُل لرز رہا تھا گھٹنوں برابر پانی اُوپر بہ رہا تھا مگر افسر الملک بہادر نے گھوڑا ڈال ہی تو دیا آہ وہ پانی کیا تھا بلا تھی ہائے گہرے سُرخ رنگ کا سیاہی مایل پانی اسمیں بُو اس غضب کی تھی کہ ناک نہ دی جاتی تھی اس پانی میں گھوڑا ابھی قدم دھرنے کا روادار نہ تھا مگر مالک کے حکم سے وہ بھی مجبور ہو گیا نواب صاحب نے گھوڑے کو رانوں میں مل کر کوڑا کیا تو غریب تلملا کر چل پڑا جب بیچ پل پر پہنچا تو تنگ تک بھیگ رہا تھا آخر وقت میں غریب نے تیر کر راستہ طے کیا اور ادھر نواب صاحب پل سے اُترے اور ادھر ایک دھماکا ہوا اور دھڑام سے پل گرا میاں سپاہی ایسے ہوتے ہیں اور مالک کے حکم پر اسطرح جان لڑانے

تیار ہو جاتے ہیں۔

جب خدایگان سرکار نے مجبور کیا تو سرکار موٹر میں سوار ہو کر با دیدۂ پُر آب قصر فلک نما رونق افروز ہوئے مگر اسقدر متاثر تھے کہ دو روز تک خاصہ تناول نہ فرمایا گھڑی گھڑی پل پل کی کیفیت دریافت فرماتے رہے افسر الملک بہادر کو مصیبت زدوں کی امداد کیلئے روانہ فرمایا، دوسری رمضان کو مہاراجہ بہادر کے نام حکم صادر فرمایا کہ پلونکی فوری تعمیر کیجائے اور رعایا کی دلدہی کیجائے، حویلی قدیم اور پنچ محلہ کو کھولنے کا حکم صادر فرمایا اور مصیبت زدوں کو ٹھہرا کر انکی خورونوش اور آسایش کی کا انتظام کرنے کا حکم مرحمت فرمایا شہر کے اندر اور باہر ہر جگہ سرکاری طور پر مصیبت زدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کھانا ملنے لگا مہاراجہ بہادر نے بھی بے انتہا مستعدی اور جانفروشی سے خلق اللہ کی مدد کی ہر طرح آسایش بہم پہنچائی ۵ر رمضان کو حضور بندگانعالی نے ایک فرمان کے ذریعہ ان خدمات پر اظہار خوشنودی فرمایا سنٹرل ریلیف کمیٹی اور والنٹیروں نے جو کام کیا اس پر ۲۷ر شوال کے فرمان مبارک میں اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا مکانات اور گلی کوچوں میں دبی ہوئی لاشوں کو نکلوا کر دفنانے میں ریلیف کمیٹی، فوج باقاعدہ، صفائی عملہ اور کوتوالی نے بڑی محنت کی آہ نعشوں میں اس قدر عفونت پیدا ہو گئی تھی کہ سامنے جایا نہیں جاتا تھا اور پھر نہ جانے پانی میں کونسا تیزاب تھا کہ تمام نعشیں گل گئی تھیں۔

دس لنگر خانے سرکار نے قائم فرمائے تھے پانچ ہندوؤں اور پانچ مسلمانوں کیلئے مولوی ظفر علیخاں[1] نے افضل گنج کے لنگر خانے کا نہایت عمدہ انتظام کیا، روزانہ پچاس ہزار آدمی ان لنگر خانوں سے کھانا کھاتے تھے چودہ پندرہ دن تک یہ لنگر خانے قائم رہے کل چھ لاکھ سے زیادہ آدمیوں نے اس سے فائدہ اٹھایا سنتیس ہزار آٹھ سو نوے روپیے صرف ہوئے ان کے علاوہ چار لنگر خانے سرکار نے جیب خاص سے مقرر فرمائے تھے جو بہت دنوں تک قائم رہے مہاراجہ بہادر نے مصیبت زدوں کیلئے چندو لعل کی بارہ دری کھلوادی تھی سرکار نے اسد باغ کی اجازت مرحمت فرمادی تھی، فتح میدان لال ٹیکری خیریت آباد میں ڈیرے اور جھونپڑیاں بھی ڈلوادی گئی تھیں!

مہاراجہ بہادر نے جریدۂ غیر معمولی کے ذریعہ ۲۳ امرداد سے ۲ آذر ۱۳۱۸ف تک دفاتر بلدہ کو عام تعطیل اور تمام ملازمین کو ایک مہینہ کی تنخواہ پیشگی دینے کا حکم صادر فرمادیا۔ اور بعد میں اُن ملازمین کی پیشگی ایصال شدہ تنخواہ معاف کردی گئی جو (۵۰عـہ) سے کم پاتے تھے۔

انجمن خواتین نے بھی مصیبت زدونکی بہت امداد کی سرکار سے تیس ہزار روپیے امداد کیلئے مرحمت ہوئے تھے جنکی ساڑیاں، شطرنجیاں رضائیاں کمبلیں وغیرہ تقسیم کی گئیں!

طغیانی کیا تھی؟ آہ تقریباً ۲۵ محلے بالکل ویران ہوگئے۔ انیس ہزار مکانات تباہ ہوئے ایک لاکھ آدمی بے خانماں ہوئے اوران میں سے آدھے سے زیادہ نذر اجل

---

[1] آقا ظفر علیخاں آف زمیندار

ہوئے اس مصیبت پر ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے گوشے گوشے سے آنسوؤں کے تار بندھ گئے ملک معظم نے وائسرائے نے شہزادہ ویلز نے، گورنر بمبئی نے، مدرسۃ العلوم علیگڈھ نے ندوۃ العلما لکھنو نے ہمدردی کے تار دیئے لندن میں کپتان صاحب سید امیر علی صاحب گوکھلے، علی اکبر لطیفی صاحب وغیرہ نے مل کر شریف لندن (لارڈ میئر) کے زیر صدارت ایک جلسہ کیا اور دس ہزار روپیہ چندہ جمع کیا، شہزادہ ویلز نے بھی دو ہزار روپیہ مرحمت فرمایا۔ حیدرآباد، سکندرآباد میں بھی بڑے بڑے جلسے ہوئے اور چندہ جمع کرکے مصیبت زدوں کی مدد کی گئی اب کس کو پوری تفصیل یاد ہے تفصیل دیکھنے کا شوق ہے تو رسالہ ادیب حیدرآباد کا طوفان نمبر دیکھو جسے مولوی سید خورشید علی[له] صاحب نے مرتب کیا ہے۔

آہ ایسی ویرانی تھی کہ وہ میاں غالب نے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا" کہا ہے اگر وہ منظر دیکھتے تو گھر کا تصور بھی نہ کرتے واللہ ایک ویرانی تھی جسکو حقیقی معنوں میں ویرانی کہہ سکتے ہیں ایسے تباہ شدہ شہر کو پھر دلہن کی طرح آراستہ کرنا ہمارے مالک حضور پرنور ہی کا کام تھا بھلا اب کوئی کہہ بھی سکتا ہے کہ کبھی یہاں ندی بھی آئی تھی طغیانی بھی ہوئی تھی طوفان بھی اٹھا تھا تالاب بنا کر ندی کا زور ہمیشہ کیلئے توڑ دیا۔ رہی بانس نہ بجی بانسری چلو اب ندی ہی نہ رہی تو طغیانی کہاں سے آئیگی اسطرح ندی کی فکر سے تو نجات ملی اب یہ محلے کھلے اور ہموار ہو جائینگے اور پختہ موریاں بن جائینگی تو ملیریا طاعون بھی دفع ہو جائینگے خداوند عالم حضور کو سلامت رکھے ہماری آسایش کیلئے کس قدر انتظام فرمایا ہے"۔

"لے لاحول ولا میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہاں ہاں بھئی بات یہ ہے کہ آراستن بلدہ

[له] مولانا سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی و مناصب و خطابات و سوانح ہیرو استیفاد وغیرہ آنریری سکریٹری حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس و بیت المعذورین وغیرہ۔

نے میرے گھر کا ایک کونا مٹرک کی تعمیر کیلئے لینے کا ارادہ کیا ہے پرسوں ہی پیمائش ہوئی ہے اور مجھ سے پوچھا جا رہا ہے کہ میں صرف اتنا کونا دینے تیار ہوں یا پورا مکان دینا چاہتا ہوں کہو کیا کروں اسی معاملہ میں تم سے رائے لینی تھی اور اسی لئے میں نے تمہیں ملنے کیلئے کہا تھا میاں اب ہمارے ملنے والے ہیں کون جن سے کچھ پوچھیں سب مرکھپ گئے جو لوگ ہیں وہ ایسے معاملوں سے بے خبر ستار طبلہ سارنگی، نبوٹ کشتی پیراکی مرغ بازی شطرنج ستار کی باتیں پوچھو تو کہیں گے مگر یہ نفع و نقصان کی چیزیں انکی سمجھ میں نہیں آتیں تم لوگ البتہ خوب سمجھتے ہو آخر مدرسہ میں تمہیں سب کچھ سکھلایا گیا ہے تم نے سود در سود کا حساب تو کیا ہوگا نا؟ کٹ متی پلیٹ سو بھی سیکھے ہونگے وہ لوگ یہ چیزیں کیا جانیں؟

ہم نے اپنا ناقص خیال ظاہر کیا دیر تک رد و قدح ہوتی رہی آخر کسی قدر ترمیم کے ساتھ ہمارا مشورہ خلعت قبول سے سرفراز ہوا ہم نے کہا کہ چلو بھرپایا مگر وہ جانے بھی تو دیں! ماما کو آواز دیکر روٹ اور چونگے منگوالئے اور ہمیں زبردستی کھلایا دم کے روٹ تھے بڑے لذیذ۔ روٹ کھا کر ہمنے اجازت چاہی تو روک کر بساط بچھا دی کہنے لگے آؤ ایک بازی کھیل لیں ہم مارکٹائی کے عادی چند مہریں کھپا کر فرزین مار لیا اور پھر قلعہ توڑ کر مات دیدی مگر میرزا صاحب کھیل کے رسیا اب کہنے میل ملے تو کیسے ایک بازی یوں ہی کھیلی اور مات لیکر اٹھنا چاہا مگر وایسی اتنی آسان نہ تھی جتنی کہ ہم سمجھے ہوئے تھے میرزا صاحب نے طاعون اور ملیریا کے متعلق اپنے معلومات کا اظہار فرمانا شروع کیا

چوہوں کی پیدائش۔ جراثیم کی آمد۔ گلٹی اور اُسکی حقیقت۔ آسان ترین علاج پہلے پلیگ کا مختصر حال اور شہر والوں کی بدحواسی انفلوئنزا اور ملیریا کا فرق دونوں کے دو جو ہات

طریق علاج پر ایسا ڈاکٹرانہ خطبہ ارشاد فرمایا کہ ہم نے اُنکی طبابت کا بھی لوہا مان لیا۔ پلیگ کی گلٹی پر بھلاواں کوٹ کر لگانا اور مریض کو مٹی کا تیل پلانا، دیکھئے کس قدر آسان نسخہ ہے اسی طرح انفلوئنزا کیلئے "ست گل بیل" کی چھ آنے والی شیشی کا ایک ہفتہ استعمال اور ملیریا کیلئے مکہ مسجد کے سامنے کے تنبولی کے پاس کا پان کا بیڑا (جس کے متعلق مشہور ہے کہ مکھی مار کر پان میں ڈالکر بیڑا بنا دیا جاتا ہے) کسقدر آسان اور عمدہ نسخے ہیں کاش یہ چیزیں میرزا صاحب کسی ڈاکٹر سے فرماتے ہاۓ ہوۓ ڈاکٹر لاری ورنہ لوٹ ہی تو جاتے!

اس قدر معلومات سے بہرہ اندوز ہونیکے بعد ہمارے دماغ کو بدہضمی ہونے لگی جماہیوں پر جماہیاں آنے لگیں۔ آنکھیں الگ بند ہو رہی تھیں۔ سگریٹ کئی گھنٹوں سے نہ پینے کی وجہ پیٹ میں بھی درد ہونے لگا ہم نے بکمال لجاجت واپسی کی اجازت چاہی اور میرزا صاحب نے بکمال سرفرازی اجازت دیدی۔ جی تو چاہتا ہے کہ حضرت کی شان میں کم از کم ایک قصیدہ لکھا جاۓ اور پھر اس خیال سے کہ "پرانی وضع کے ہیں لوگ اُن کو کچھ نہ کہو" خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

مولوی جی

ہمارے مولوی جی مدرسے کے معلّم یا مسجد کے پیش امام نہیں۔ اور نہ مولوی اصغر کے خاندان کے رکن ہیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود مولوی اور صرف مولوی ہیں۔

والد بزرگوار مولوی جی کے متعلق فرماتے تھے۔ کہ مولوی جی کے والد گڑاکو کی دوکان کرتے تھے۔ انکی دوکان کا خمیرہ سارے شہر میں مشہور تھا۔ مولوی جی کی ابتدائی تعلیم محلہ کی مسجد میں ہوئی۔ بغدادی قاعدہ ختم کر کے کلام اللہ کی تعلیم پائی۔ اور پھر آمدنامہ۔ کریما۔ مامقیماں۔ رقعات عنایت علی وغیرہ وغیرہ۔ اسی مسجد کے ملّاں جی یا میاں جی سے ختم کیں۔ اور پنچالگوڑہ کے مشہور عامل حضرت ہدایت علی صاحب مرحوم سے۔ نجوم۔ جفر۔ رمل۔ تعویذ فلیتہ۔ گنڈا۔ جھومنتر وغیرہ کی سند لی۔ سنا ہے کہ مشہور ہتوٹ بازاستادو ننگش سے پٹہ۔ روز لکڑی بھی سیکھی۔ مگر پیترے برابر نہ پڑتے تھے۔ مجبوراً ترک کر دیا۔ مگر

اپنے تئیں ہمیشہ بڑے تلوارئے پھیکیت، ہنوٹے سمجھا کیئے۔ مولوی نادر الزماں مرحوم کے حلقۂ درس میں مدتوں شرکت کی۔ پڑھا تو کچھ بھی نہیں۔ صرف سنا کرتے تھے حضرت فیض اور حضرت مسکیں کے مشاعرے میں سب سے پہلے موجود رہتے تھے محرم کے زمانہ میں نتھو بیگ اور نصر اللہ کے رنگ کی سیر بھی کر لیتے۔ باپ کے مرنے پر دوکان سنبھالی مگر قدرت نے انہیں مولویانہ دماغ دیا تھا۔ بیوپار کیلئے کسی طرح موزوں ثابت نہ ہوئے۔ دوسرے ہی سال دیوالہ پٹ گیا۔ اور مولوی جی بیک بینی و دو گوش دوکان سے نکلے۔ یہ مختصر سوانح تھی جو والد مغفور نے ایک دفعہ ہم سے بیان فرمایا تھا!

ہم اپنے بچپن سے مولوی جی کو ایک حالت پر دیکھ رہے ہیں والد مغفور کے پاس ہمیشہ تشریف لاتے تھے۔ ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ (اندر کھدر کا چھا تھا) پاؤں میں مارکٹ کا گھیتلا جوتا۔ گھٹنوں سے نیچا لانبا کرتا۔ اندر کھدر کی موٹی نیم آستین ڈھیلا ڈھالا ململ کا شاہا سر پہ سفید بہ مقدار علم شملہ، کندھے پر چرپالی صوفیانہ رومال آنکھوں میں دنبالہ دار سرمہ۔ ڈاڑھی چنبیلی کے تیل سے لپی ہوئی دانت کثرت پان خوری سے لال مگر ہونٹ بالکل سفید۔

منشی قمر الدین صاحب اور نتھو چچا مولوی جی کو بے طرح ستاتے مگر وہ بگڑتے بہت کم تھے۔ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتے۔ ایک دفعہ ان حضرات نے پان میں نسی ڈال کر دیدیا مولوی گلوری چبا گئے مگر انہیں گھر جانے کے بعد معلوم ہوا کہ

ہونٹوں پر دُہری جھلّی ہے۔ بہت بگڑے کئی دن تک اُن لوگوں سے گفتگو نہ کی مگر یہ حضرات چوکنے والے تھوڑے ہی تھے۔ خوشامد کرکے منا ہی لیا۔

آخری چہار شنبہ اس زمانہ میں خاص اہتمام سے منایا جاتا تھا۔ یارانِ بے تکلف میر عالم کے تالاب پر پہنچ گئے۔ اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر مولوی جی کو بھی ساتھ لے لیا۔ بارہ بجے کھانا کھا کر لوگوں کو تیراکی سُوجھی سبھوں نے شریفانہ لباس اتار کر لنگوٹ۔ جانگیا۔ رومال باندھ لیا اور لگے تیرنے مولوی جی تیرنا جانتے نہ تھے۔ نجّو چچا نے پانچ منٹ میں تیرنا سکھانے کا وعدہ کرکے مولوی جی کے کپڑے اتروا دیئے اور رومال بندھوا کر تالاب میں ڈھکیل ہی تو دیا۔ بیچارے غوطے کھاتے رہے بڑی دیر کے بعد اُنہیں سنبھالا۔ اور کنارے چھوڑ گئے۔ مولوی جی چونکہ تھک گئے تھے۔ اس لئے دیر تک تالاب کے کنارے لیٹے رہے۔ سبھوں نے تیرنا ختم کیا اور کپڑے پہن کر مختلف کھیلوں میں مصروف ہو گئے۔ کسی طرف شطرنج ہونے لگی کوئی پچیسی لے بیٹھا۔ کہیں پر تاش اڑنے لگا۔ کسی نے ڈومنا (ترکی گنجفہ) شروع کیا۔ بھلا اب مولوی جی سے نچلا بیٹھا جاتا تھا۔ لیٹے لیٹے اُٹھ کھڑے ہوئے کونا کونا دیکھ ڈالا۔ ہر جگہ ڈھونڈا مگر کپڑے ندارد۔ بھیگا رومال باندھے ہوئے سب لوگوں کے بیچ میں آ گئے اور لگے عربی آمیز اردو میں رجز خوانی کرنے کبھی انکی تان منشی قمر الدین صاحب پر ٹوٹتی اور کبھی نجّو چچا پر۔ بہر حال ایک گھنٹہ تک۔ مولوی جی نے سلسل فصاحت و بلاغت کے دریا "لب تالاب کے کنارے"

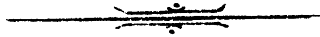
بہائے۔ تب کہیں محبوب بیگ صاحب نے انہیں پتہ دیا کہ کپڑے گٹھڑی کی شکل میں برگد کے درخت پر لگے ہوئے ہیں۔ مشکل یہ تھی کہ مولوی جی درخت پر بھی نہیں چڑھ سکتے تھے۔ بیچارے سیّد نے ان کو کپڑے نکال دیئے۔ مولوی جی نے سیّد کو دعا اور سبھوں کو گالیاں دیتے ہوئے نیم آستین۔ کرتا شاہی پہن لیا۔ اب جو پیجامہ پہنتے ہیں تو کلیاں ہیں نہ رومالی۔ صرف پائینچے اور نیفہ بس آگ ہی تو ہو گئے۔ وہ وہ محاورے سنانے لگے کہ شاید ہی کسی نے ایسی تقریر کبھی سنی ہوگی۔ دیر تک خطبہ دیتے رہے۔ مگر جب سیّد نے نجّو چچا کے آگے مٹھائی کی کشتی اور چائے کا سٹ لگا دیا تو آپ بھی عمامہ باندھتے ہوئے پہنچ گئے۔ ایک بالائی کی پوری۔ دو تین گلاب جامن اور تقریباً پاؤ بھر برفی کھا کر ایک لب بند۔ لب سوز۔ لب ریز پیالی خالی کر دی۔ تب کہیں چین آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مولوی جی خوش تھے۔ نہ تو ڈوبنے کا ملال تھا نہ پاجامے کا رنج۔ مجسم زندہ دلی تھے۔

والد مرحوم جب تک شہر میں تھے مولوی جی برابر آتے رہے جب وہ باہر گئے تو مولوی جی نے آنا جانا ترک کر دیا۔ کبھی کبھار راستہ میں مل جاتے تو پرخلوص علیک سلیک ضرور ہو جاتی تھی۔ والد مرحوم کے انتقال کے بعد ایک دفعہ غریبخانہ پر تشریف لائے نہایت خلوص سے پرسا دیا خود بھی روئے ہمیں بھی رلایا اور چلتے بنے۔

رمضان کی عید کے دوسرے روز ٹھیک ڈیرہ بجے چلچلاتی دھوپ میں ہم جا رہے تھے لطیف الدین صاحب کے پاس اتفاقاً دبیر پر ہیں حضرت نے دیکھ لیا۔ اور لگے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے اجی میاں، او عابد میاں بھئی تمکین، اجی کاظمی صاحب، او حضرت، بھلا ہماری کیا مجال تھی جو آگے بڑھتے۔ سائیکل روک لیا۔ اور حضرت سے مخاطب ہو گئے۔ عید کی مبارکباد نمازِ عید کا تذکرہ۔ روزوں کے متعلق استفسار اور گرمی کا دکھڑا ایک ہی سانس میں سب کچھ سنا دیا۔ ہم تو پسینے میں نہا گئے۔ نئی شیروانی بھیگ گئی۔ ہم نے کہا تقصیر معاف ہمیں بخارِ کہنہ ہے دھوپ میں تکلیف ہوتی ہے۔ بس ہمارا ہاتھ تھام کر گلی کا رخ کیا۔ ایک پست سفال پوش مکان کی کنڈی کھٹکھٹائی اور کواڑ کھلتے پر خود اندر تشریف لے گئے۔ چار منٹ کے بعد نہایت ہی قرأت کے ساتھ اندر تشریف لانے کی تلاوت فرمانے لگے۔ ہم نے بصد مشکل دو تین بار پھٹے ہوئے ٹاٹ کے پردے میں الجھ کر اپنے آپ کو معہ سائیکل دروازے کے اندر پہنچا دیا۔ ایک مختصر حجرے میں جس میں ایک پھٹا ہوا بوریا اور اسکے اوپر پرانی شطرنجی بچھی ہوئی تھی۔ جس پر ایک سوزنی یا چاندنی ایسی بچھی ہوئی تھی جس کا کوئی مستقل رنگ شاید ہی کبھی ہو۔ حجرہ بلا مبالغہ چھ فٹ مربع اور اسی قدر اونچا ہوگا۔ ہم نے ایک کونے میں ڈیرہ ڈال دیا۔ مولوی جی صدر میں متمکن ہو گئے اور لگے زمزمہ سرائی کرنے خواجہ حسن نظامی اور مولانا محمد علی کی لڑائی۔ ابن سعود کے

اعتقادات، حکیم اجمل خاں مرحوم کی خدمات۔ مولوی شبیر احمد کے وعظ، ترکوں کی معاشرت، امیر کابل کی سیاحت۔ ملکہ کابل کی بے پردگی۔ غرض دنیا کی کوئی چیز ایسی نہ بچی جس کا تذکرہ مولوی جی نے نہ فرمایا ہو۔ اور پھر اس پر اپنے خیال کا اظہار نہ کیا ہو۔ اخیر میں اگلی صحبتیں یاد آ گئیں۔ کہنے لگے میاں وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ خدا غریق رحمت کرے تمہارے والد بنّو میاں منشی قمر الدین ستّار خاں، عبداللہ خاں، مولوی اسمٰعیل غوثو میاں کیسے کیسے لوگ تھے کچھ تو مر گئے اور جو باقی ہیں وہ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے ہیں، نہ فراغت ہے نہ اطمینان۔ نہ زندہ دلی ہے نہ چُہل۔ دل ہی تو بجھ گئے۔ وہ آخری چہار شنبہ کے جلسے۔ وہ مولا کا عرس۔ وہ لنگم پلی کا میلا۔ وہ عرسوں کے جھگڑے وہ محرم کے رنگ۔ وہ نویں کی رات کو الاؤں کی زیارت وہ سرکاری لنگر ہائے۔ اللہ کیا زمانہ تھا۔ اجی ہم کس عرس میں نہ جاتے تھے۔ کون سے میلے میں شریک نہ ہوتے تھے۔ کونسی محفل چھوٹتی تھی۔ ہائے ہائے کیا پاکیزہ صحبت تھی۔ رند بنے تو پکے رند۔ کوئی عرس۔ کوئی میلا۔ کوئی جھگڑا نہ چھوٹا۔ سبھی عالم فاضل تھے۔ کیسے کیسے مباحثے ہوتے۔ جا لعالم سے بحثیں ہوتیں۔ عبدالحی وحابی سے مناظرہ ہوتا۔ ترکی سے فارسی میں جھڑپ ہوتی تو مائل سے اردو میں۔ خدا مغفرت کرے قطب میاں اجی وہی کیفی تو غضب تھا غضب کسی کو بڑھنے نہ دیتا۔ غلام حسین داد عبدالحی بانرغ۔ سورج پہان۔ بیکش۔ ثاقب۔ کیفی۔ ناظم۔ تجلّی۔ تشنہ۔ تسلّی

شوق کیسے کیسے شاعر تھے۔ مشاعرہ انہیں کی وجہ سے ہوتا تھا۔ ہائے سب کے سب مر گئے۔ معلوم نہیں مولوی جی یاران رفتہ پر کب تک ماتم کرتے خیر یہ گذری کہ ہمیں مارے گرمی کے شدید درد سر ہونے لگا اور ہم معافی مانگ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور ان کے گھر سے نکل کر سیدھے حسین ساگر کے کٹے پر جا کر دم لیا۔



منشی جی

منشی جی کی ہستی علمی دنیا کیلئے بہت مفید اور کاروباری دنیا کیلئے بے انتہا ضروری ہے۔ یہ منشی جی کسی گورے کو نہیں پڑھاتے۔ کسی دفتر میں کام نہیں کرتے۔ کسی دوکان سے تعلق نہیں رکھتے۔ کسی شخصیت کے محتاج نہیں۔ "اپنے قلم سے آپ روزی کماتے ہیں، خود کھاتے ہیں، اوروں کو کھلاتے ہیں۔" غالب نے انہیں کیلئے کہا تھا ؎

کوئی لکھوائے انکو خط تو آ کر ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور رکھ کر کان کے اوپر قلم نکلے

منشی جی خدا کے فضل سے وقت کے بہت پابند ہیں۔ صبح ½ ۵ بجے خواب راحت سے بیدار ہوتے ہیں۔ اگر جیب میں زیادہ "زیرگاری" ہوا (جسکو منشی جی اپنی اصطلاح میں "خردہ" کہتے ہیں) تو گھر سے سیدھے "مغل ہوٹل" کو چلے اور "نہاری کلچوں" کا ناشتہ اڑایا۔ ایک لب بند۔ نسب زیر۔ بالائی آمیز

مگر لب سوز نہیں برف انگیز چائے کی پیالی پی لی۔ اور آٹھ پیسے کی "افیون" گھلا گھلا کر کھائی۔ اور پھر چلے۔ اس وقت منشی جی نظام الملک طوسی یا ابوالفضل فیضی سے کم نظر نہیں آتے۔ ہزاروں شعر نوکِ زبان گلستاں بوستاں۔ کریما۔ مامقیماں کے شعر۔ آمدن نامہ کی گردانیں منہ ہی منہ میں دہراتے ہوئے جاتے ہیں۔ مگر یہ سب "عاشور خانہ" تک وہاں پہنچتے ہی سب رفو چکر۔ صرف ایک شعر بلکہ بعض وقت ایک ہی مصرع

بہ تمنائے گوشت مردن بہ

حافظہ میں محفوظ رہ جاتا ہے۔ نکڑ ہی سے قصائی کو گھورتے ہوئے دکان تک پہنچ جاتے ہیں۔ آئندہ کا وعدہ۔ منحوس طاعون کا تذکرہ۔ اپنے محلہ کی حالت نہاری کی بدمزگی۔ کلیجوں میں گھی کی کمی۔ چارہ کی خرابی۔ دودھ اور شکر کی کمی بارش کی قلت۔ چارہ کا عنقا ہونا۔ بکروں کی گرانی۔ مگر باوجود اسکے مخاطب کا عمدہ بکرے لانا اور ارزاں گوشت فروخت کرنا۔ یہ تمام باتیں وقتِ واحد میں نہایت ہی چرب زبانی بلکہ شیوہ بیانی کے ساتھ کیجاتی ہیں "بڑے صاحب" اپنے مال کی تعریف اور پھر گرانی کے باوجود ارزاں فروخت کرنے کا حال سنکر پھول ہی تو جاتے ہیں۔ اِدھر اُدھر گھور کر دیکھا۔ ذرا مونچھوں کو کھڑا کیا اور پھر پوچھا "منشی صاحب پسندے دوں یا قیمہ" منشی جی نے وقار آمیز متانت کے ساتھ قیمہ مانگا۔ اور ایک پتے میں پاؤ بھر قیمہ۔ بلّی کیلئے چند

ہڈیاں۔ کچھ چھچھڑے لیکر چلیے۔ "کمیلے کی مسجد" کے ہاں سے ادرک لہسن گرم مصالحہ دال۔ نمک۔ پودینہ۔ کوتمر۔ زیرہ۔ لوچوار۔ امچور۔ اور چھوٹے چھوٹے بینگن لیکر ٹھیک سات بجے گھر پر موجود۔

اور پھر دس منٹ کے بعد منشی جی ایک قلم کان پر ایک جیب میں رکھے۔ مٹی کی دوات ہاتھ میں لئے چند میلے کاغذوں کو بغل میں دابے کونے کونے "رولر سگریٹ" کی خالی ڈبیاں ڈھونڈھتے ہوئے اڈے کو چلیے پہلے توصفائی کی امین کچہری کے شیڈ میں سے ٹوٹی ہوئی جھاڑو لی اور اپنے اڈے کو جھاڑا اور پھر اُسے رکھکر پھٹی ہوئی شطرنجی جو دو فٹ مربع ہوگی ذرا جھٹکی گئی اور اس سے کسی قدر بوسیدہ بوریہ کا ٹکڑا لیکر اڈے کو سنوارا ادھر اُدھر سے دو چار پتھر ارے لاحول ولا پیپر ویٹ لیکر بیچ میں رکھدیا خود چار مینار کے کٹھہرے[1] کو ٹیکا دیکر بیٹھ گئے پہلے ایک نظر دونوں طرف ڈالی "وزیر علی بادشاہ" کی ڈیوڑھی کے دروازے کو گھورا۔ "علی میاں" کے چائے خانے کو للچائی نظروں سے دیکھا۔ اور پھر ایک لمبی نظر میداں خاں کے چوک کا نٹرے جعفر علی کے تابوت۔ بلکہ مال والوں کی ڈیوڑھی تک ڈالی۔ ایک

---

[1] اللہ بخشے عالم آرائش بلدہ والوں کو انہوں نے یہ کٹھہرا اکھیڑ کر پھینک دیا اور اب منشی جی کی پیٹھ کا یہ سہارا جاتا رہا۔

ٹھنڈی سانس لیکر جیب سے رقعات عنایت علی نکالا۔ اس پر کچھ کاغذ رکھکر ایک کونے پر رکھدیا۔ اور اوس کے اوپر قدرتی پیپر ویٹ اس کے جواب میں دوات اور جیب میں کا "بروکا قلم" اور "چاقو" بیچ میں کندھے سے رومال اُتار کر رکھ چھوڑا اور لگے مراقبہ کرنے!

منشی جی ہمارے قدیم کرمفرما ہیں جس زمانہ میں کہ ہم ابتدائی تعلیمی مراحل "دھرم ونت اسکول" میں طے کر رہے تھے ہمیں گھر سے ایک کاپی دیجاتی تھی جس پر کلاس ماسٹر کے دستخط بقید تاریخ و وقتِ حاضری لینے کا حکم تھا۔ ابتدا میں تو ہمنے ماسٹر صاحب کے دستخط لئے۔ مگر تا بہ کے۔ آخر روز کی حاضری اور پھر وقت کی پابندی کس سے ہوئی ہے جو ہم سے ہوتی محرم کے پہلے ہفتہ میں ہم ایک روز بجائے اسکول کے "نھتو بیگ" کے رنگ میں حاضر رہے۔ مگر واپسی پر کاپی کے معرا ہونے کے خیال نے بیچین کر دیا۔ اتفاقاً منشی جی کا خیال آگیا۔ ہم جلدی سے جا پہنچے۔ تاریخ وقت لکھوالیا۔ اور اُن کے دستخط بھی کرائے۔ گھر پر کہدیا کہ استاد بدل گئے ہیں۔ یہ نئے استاد کے دستخط ہیں۔ چلو چھٹی ہوئی۔ خدا سلامت رکھے منشی جی کو انہوں ایک مہینہ تک برابر دستخط کئے۔ مگر ہماری قسمت کو کیا کرتے گھر پر اطلاع پہنچی اور ہم پٹے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ مگر منشی جی ہمارے پرانے شناسا تھے۔

جس زمانہ میں کہ ہم منشی جی سے ملتے تھے اُن کا روزگار خوب چلتا تھا

دفاتر کے رسائل۔ درخواستیں۔ عرضیاں۔ خطوط۔ منی آڈر فارم۔ اسم نویسی۔ رقعے غرض کے سینکڑوں چیزیں ان سے لکھوائی جاتی تھیں۔ حیدرآباد میں تعلیم کا چرچا کم تھا۔ خوش قلم عرضیاں۔ خوشخط درخواستیں۔ ٹائپ اور ترجمہ کے سائن بورڈ کہیں تھے ہی نہیں۔ مطبعے بھی اس کثرت سے نہ تھے۔ اور نہ وہاں کچّا خط لکھنے والے کاتب ہی تھے۔ دفاتر میں امیدواروں۔ عرایض نویسوں کی یہ کثرت نہ تھی۔ جو کچھ تھے یہی منشی صاحبان تھے جو چارمینار کے چاروں طرف

دو زانو بیٹھے ہوئے تھے قلم دبائے ہوے

پرسوں ہم "شاہ علی بنڈہ" کی طرف جارہے تھے مگر سرکار کی سواری شاید آنے والی تھی۔ روک ٹوک کی وجہ سے ہم نے تھوڑی دیر چارمینار کے گرد چکّر کاٹنا مناسب خیال کیا۔ پہلے تو حقیر فقیر پُر تقصیر ہیں نہیں۔ بلکہ محمّد منیر مرمّن دنداں ساز کی دُکان اور چند ہوٹلوں کے بیرونی حصوں کا معائنہ کیا پھر ذرا آگے بڑھکر چارمینار کی خاص علامت "بلّی کے سر" پر غور کیا۔ اس کے بعد جو اِدہر اُدہر نظر ڈالی تو منشی جی کو بھی اسی پرانی جگہ بیٹھے ہوئے بوریہ پر مصروفِ مراقبہ پایا۔ ہم نے کہا چلو انہیں سے گفتگو کریں۔ دیر تک پاؤں پٹکنے اور آواز دینے کے بعد منشی جی مراقبہ سے چونکے۔ نیم باز آنکھوں سے سرسری ملاحظہ فرمایا۔ اور پھر منہ ہی منہ میں کچھ کہتے ہوئے مراقب ہو گئے ہم نے جو زور زور سے سائیکل کی گھنٹی بجائی تب کہیں انہوں نے سر اٹھایا اور آنکھیں چار کیں۔ کہنے لگے میاں!

آپ ہیں؟ میں سمجھا کوئی حضرت چھیڑنے کیلئے آگئے ہونگے۔ آجکل نوجوانوں نے بہت ستانا شروع کر دیا ہے۔ میں نے کہا منشی جی اب کیا حال ہے۔ کچھ ملتا بھی ہے یا دن بھر اونگا ہی کرتے ہو۔ کہنے لگے ”میاں کیا کہوں کوڑی کا کام نہیں ہوتا۔ سامنے محلّات کا دفتر تھا۔ وہ اب پنچ محلہ کے پاس چلے گیا۔ پڑھنے لکھنے والے بہت ہو گئے۔ خدا بھلا کرے ان انگریزوں کا انہوں نے ٹائپ نکال دیا۔ ٹائپ، اس سے تو ہم بے موت مر گئے۔ یہ پڑھے لکھے بچے مڈل میٹرک پاس کر کے دکانوں پر بیٹھ گئے۔ آپ دیکھتے ہونگے نا۔ ایک صاحب نے ”ٹائپ اور ترجمہ کیا جاتا ہے“ لکھ کر تختی ہی لگا دی ایک نے سبز رقم لکھکر لٹکا دیا سب لوگ خوش قلم عرضیاں لکھنے لگے۔ مطبعے بہت ہو گئے۔ کاتب بھی اب کاپی نویسی چھوڑ کر درخواست نویسی پر اتر آئے۔ بچہ بچہ لکھنے لگا سب تو سب غضب خدا کا یہ ہے کہ عورتیں لکھنے پڑھنے لگی ہیں۔ کل کی بچیاں خط لکھ لیتی ہیں۔ پہلے کے طریقے ہی نہ رہے۔ اسم نویسی مٹ گئی۔ اقرار نامے تمسک نہ رہے۔ دیکھئے تو اب سفید کاغذ پر دولہا کا نام اس کے باپ دادا اماں اور نانی کے نام اردو میں لکھ کر بھیجنے لگے۔ نہ وہ عبارت آرائی رہی نہ وہ خاص سرخ کاغذ رہا۔ نہ وہ خاص مضمون ہی رہا اب کی اسم نویسیاں دیکھئے نہ تو ”بسم اللہ“ نہ ”نحمدہ و نصلّی“ غضب یہ کہ پہلے اسمائے مستورات در پردۂ عصمت لکھ کر چھوڑ دیتے تھے۔ اب کے لوگ

پردے کی بیٹھنے والیوں کے نام تک لکھنے لگے۔ اللہ اللہ کیا زمانہ بدل گیا۔ پہلے اسم نویسوں میں لکھا جاتا تھا کہ "ہرجا کہ خواہند دریافت فرمائند" اب سرے سے کچھ لکھا ہی نہیں جاتا۔ اجی دعوت کے رقعے دیکھئے سر نہ ٹانگ "لطیف الدین اور بیبی متمنی ہے کہ شرکت عقد و تناول طعام سے ممنون فرمائیں۔" ایک کونہ پر وقت۔ ایک جگہ مقام۔ بس رقعہ ختم۔ آپ ہی کہئے یہ کوئی دعوت کا رقعہ ہے۔ آیت نہ حدیث۔ قافیہ نہ ردیف۔ چار انگل کے اُدھے پیلے کارڈ پر بھونڈا مضمون چھاپ دیا۔ خطوں کو دیکھئے "مکرمی" "مشفقی" "محبی" تو اب ذرا معمر اور پرانے خیال کے لوگ لکھتے ہیں نوجوان تو بس "ڈیر" لکھکر چلے گھالش کرتے ہوئے۔ خط کیا لکھ رہے ہیں گویا بیچنامہ کر رہے ہیں۔ لاحول ولا اب کہئے ہم جیسے بوڑھوں سے کون لکھوائے گا ہمارا پیٹ گیا چلیگا اب شریفوں سے تو ہم ہاتھ دھو بیٹھے۔ بیچارے غریب مزدور۔ پان سگرٹ والے کبھی کبھار خط کارڈ لکھوا لیتے ہیں اور دو پیسے ہم کو ملجاتے ہیں اگر یہ نہوتے تو ہم کبھی کے کہ مسجد کی سیڑھیوں کے پاس بیٹھے بھیک مانگتے نظر آتے یہ کہکر منشی جی آبدیدہ ہو گئے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھر آئیں۔ پچکے ہوئے گال پھول گئے۔ ہاتھ میں رعشہ زیادہ ہو گیا۔ بہ ہزار دقت پھٹا ہوا رومال زانو کے نیچے سے نکالکر آنسو پونچھے اور ایک سرد آہ کھینچکر کہا "میاں ہم زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ مگر برے حالوں۔"

زن مُرید

جہاں تک میں نے سنجیدگی سے غور کیا "زن مریدوں" کے اقسام حسبِ ذیل پائے گئے۔

(۱) اپنی فطری کمزوریوں کی وجہ سے بیوی سے خوف زدہ رہنے والے
(۲) بیوی کے تمول یا اسکے والدین کے اثرات سے ڈرنے والے۔
(۳) بیوی کی خوبصورتی سے متاثر ہوکر دبے رہنے والے۔
(۴) بیوی کی ضد، غصّہ، ہٹ، یا تعلیم کی وجہ سے محکوم رہنے والے۔
(۵) خواہ مخواہ بلا کسی وجہ کے سہم جانیوالے۔

پہلے زمرے میں وہ لوگ شریک ہیں جو یا تو دائم المریض ہوں یا بقول بعض اشتہاری دوا فروشوں کے بچپن کی غلط کاریوں کی وجہ لطف زندگی کھو بیٹھے ہوں۔

دوسرے وہ جو "گھر داماد" ہوں یا بیوی کے روپئے پر گذر بسر کرتے ہوں

یا اوس کے والدین وغیرہ سے سفارش وغیرہ کی امید رکھتے ہوں۔

تیسرے وہ ہیں جو رفیق زندگی کی خوبصورتی پر بے طرح مرمٹے ہوں۔

چوتھے وہ گربہ یا گاؤ صفت بزرگ جو نہایت غریب سادہ لوح، قدیم الخیال، کم تعلیم یافتہ غیر مستقل مزاج ہوں۔

پانچویں وہ حضرات جو مذکورہ بالا چاروں طبقوں سے بھی تعلق نہ رکھتے ہوں مگر فطرتاً "پاپوش کاری" کیلئے بنائے گئے ہوں۔

میں ایک مدت سے اس پر غور کر رہا ہوں مگر ابتک کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی اور نہ امید ہے کہ کبھی سمجھ میں آئے گی۔ میں نے اکثر اصحاب کی طرز معاشرت پر غور کیا ہے بعض لوگوں کے حالات کسی قدر دلچسپ ہیں ممکن ہے کہ ان کو سنکر بعض احباب کوئی مستقل خیال قائم کرسکیں۔

میرے ایک ملاقاتی بہت مسن ہیں سن شریف دو بیس (۴۰) سے زیادہ ہے مگر ابھی تک بکمال انکسار اپنے آپکو کم از کم جوان تصور فرماتے ہیں و نیک بختو کو میر مومن کے دائرہ میں سُلا چکے ہیں۔ اب تیسری کے دام زلف میں اسیر ہیں مگر اس بری طرح پھنسے ہیں کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ بیوی سے اس قدر ڈرتے ہیں جس قدر کہ ایک بغدادی قاعدہ پڑھنے والا لڑکا اپنے میانجی یا اس مسجد کے ملا کی چھڑی سے ڈرتا ہو جہاں کہ وہ پڑھنے جایا کرتا ہے۔ یہ پہلے زمرے سے متعلق ہیں اور صرف یہی ایک ہیں جو اس معزز طبقہ کے افراد ہیں جو میرے ملاقاتی ہیں

دوسرے طبقہ کے اکثر بزرگوں سے واقف ہوں۔ ایک بزرگوار ماموں زاد ایسوسی ایشن کے ممبر یعنی اپنی ماموں زاد بہن کے شوہر ہیں۔ بدنصیبی سے بچپن ہی میں یتیم ہوگئے تھے۔ ماموں ہی نے پڑھایا لکھایا اور نوکر رکھا دیا ان حضرت کی وقعت اپنی بیوی کے پاس وہی ہے جو ایک تانگہ والے کی پولیس کانسٹیبل کے پاس ہوتی ہے۔ بی۔ ایس۔ سی۔ ہیں مگر بیوی سے اسقدر مرعوب کہ اگر وہ ہلدی کی گرہ کو "ہڈروفلورک ایسڈ" کہدے تو یہ معمل میں جاکر ثابت کرنے کو تیار ہو جائیں گے کہ واقعی ہلدی "ہڈروفلورک" ہے اور ایک صاحب جو اسی زمرے سے متعلق ہیں۔ اس ایسوسی ایشن کے ممبر تو نہیں مگر اپنے خسر کے تمول کی وجہ سے اس قدر مرعوب رہتے ہیں کہ ان کے ملازمین نے کلکتہ کے گلشن سلیپر سے انکی چندیا کے بال نکلتے دیکھا ہے۔

تیسرے طبقہ کے لوگ اکثر ملتے ہیں۔ ایک میرے عزیز بلائے حسن میں اس قدر مبتلا ہوئے کہ چوتھی چالوں کے اندر ہی اندر ماں بھائی بہن سب کو چھوڑ چھاڑ کر نیک بخت کے ساتھ علیحدہ جاکر رہ گئے۔

اور ایک کرمفرما نے اپنے شوق ذوق کو محض اس لئے ترک کر دیا کہ انکی صاحب جمال رفیقۂ زندگی کی فرمائشات کی تکمیل کیلئے روپیہ کافی نہ تھا۔ اب وہ بجائے سینما دیکھنے کے صابن خریدتے ہیں۔ بجائے سگرٹ پینے کے پوڈر اور کریم لیتے ہیں۔ اور بجائے ہوٹل میں آئسکریم کھانیکے

بیوی کیلئے ساڑھی کی تو ریجاتے ہیں۔ اب یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ وہ کبھی اِن عادات واطوار کے بھی تھے یا کیا۔ ایک زمانہ میں وہ دن بھر میں صرف دو وقت گھر جایا کرتے تھے مگر اب دن بھر میں ایک وقت بھی دس منٹ کیلئے گھر سے باہر نہیں نکلتے۔

ایک صاحب اس بُری طرح رتجھے ہوئے ہیں کہ ایک روز کیلئے بھی کہیں باہر جانا ہوتا ہے تو نیک بخت ساتھ ہوتی ہیں۔

جو تھے طبقے کے لوگ فی زمانہ ذرا کم ہیں۔ مگر قربان جائیے خالق کے کہ اس تماشا گاہِ عالم میں طرح طرح کے پتلے نچاتا ہے ایک مولوی صاحب جو نہایت ہی کم سخن متین سنجیدہ ہیں۔ اس قدر مجبور ہیں کہ کوئی اِن کے گھر پر ملنے جائے تو بازار سے منگوا کر پان کھلاتے ہیں۔ یہ محض اس لئے کہ بیوی صاحبہ پان کی فرمائش پر اس قدر خفا ہوتی ہیں کہ اِن کو کم از کم دو روز تک پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا۔

ایک بزرگ جبتک باہر رہتے ہیں چار چھ ڈبیاں سگریٹ کی خالی کر ڈالتے ہیں۔ مگر گھر میں کھانا کھانیکے بعد بھی سگریٹ پینے کی مجال نہیں۔ اس لئے کہ بیگم صاحبہ کو اس سے نفرت ہے۔

ایک صاحب کو بلا اجازت گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں۔ اگر اتفاقاً رات بھر غائب رہیں تو صبح داخلہ ممنوع۔ مگر یہ اس قدر متین آدمی ہیں کہ

"میلاد شریف" کی شرکت کی اجازت لیکر احباب کے ہمراہ تھیٹر اکثر دیکھ لیتے ہیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ میرے ملنے والوںمیں اس پانچویں طبقہ کے لوگ بہت ہیں۔ ایک کرمفرما جو ماموں زاد ایسوسی ایشن کے ممبر اور ریاضیات کے گریجویٹ ہیں۔ ایسے خواہ مخواہ ہیں کہ پوچھئے نہیں بفضلہ تعالےٰ گذشتہ چاروں طبقوں سے غیر متعلق مگر بے طرح پھنسے ہوئے ہیں اگر بیگم صاحبہ ایک خط مستقیم کو زاویہ حادہ فرما دیں تو یہ جیومیٹری سے نہ سہی الجبرا ہی سے سہی مگر ثابت ضرور کر دینگے کہ زاویہ خط مستقیم ہے۔ دوسرے ایک بزرگ جو اسی ایسوسی ایشن کے ممبر ہیں نہایت ہی پریشان رہتے ہیں اگر ان کے کسی عزیز کو ترقی ملتی ہے تو انکی نیک بخت دو ہفتہ جلاپا شروع کرتی ہیں کہ دیکھو تمہارے فلاں عزیز کو ترقی ملی اور تم منہ دیکھا کئے تم بھی ترقی کرو مگر یہ بیچارے سوائے اس کے کہ اپنی سادہ لوحی میں ترقی کریں اور کچھ نہیں کرتے اور ایک بزرگ جو ایک معزز پیشہ کرتے ہیں اسی خواہ مخواہ میں مبتلا ہیں۔ انکی خزانہ دار بیگم صاحبہ ہیں۔ اگر کہیں باہر جانا ہوتا ہے تو بڑا اور ڈیش کیجاتی ہے کہ کرایہ ریل، کرایہ تانگہ، حمالی اسٹیشن، سوڈا، سگریٹ، چاء، بچوں کے لئے کھلونے، اخبار یا بک سٹال پر سے کوئی ناول۔ مگر یہ مد باقی نہیں رہتی اور نہ ان کا تخمینہ ہی کام دیتا ہے۔ کرایہ ریل تو خیر جنتری میں دیکھ لیا جاتا ہے مگر غضب یہ ہے کہ اسپنسر کے سوڈے کے بجائے ڈالٹن کا سوڈا پینے کیلئے

ایک آنہ اور رفرشمنٹ روم کے بجائے گرم چاء پینے کیلئے ایک آنہ منظور ہوتا ہے
غور کیجئے بیچارے کس قدر معذور ہیں۔ ایک صاحب ہمیشہ بوتل بدست نظر
آتے ہیں۔ جب کبھی دیکھئے دواخانہ کی گیٹ پر موجود۔ اگر ڈاکٹر صاحب آپریشن
روم میں بھی ہوں تو یہ وہیں پہنچکر کیفیت سنانے لگتے ہیں" ڈاکٹر صاحب
سنئے تو سہی رات مکان میں طبیعت بہت خراب رہی مغرب کے بعد سے
دس بجے رات تک دو گلاس پانی پی گئیں۔ نیند بھی ٹھیک طور پر نہیں آئی
کروٹیں بہت بدلتی رہیں۔ چھ سات بار کروٹ بدلی ہوگی صبح بھی جلد یعنی
$8\frac{1}{2}$ بجے بیدار ہوگئیں کہئے بخار تو نہیں ہوگا

اگر یونہی تفصیل لکھی جائے تو مشکل ہے۔ طلسم ہوشربا کی طرح کئی جلدیں
درکار ہونگی۔ میں انہیں فی الحال ختم کرتا ہوں مگر ایک بات پریشان کن یہ ہے
کہ بعض افراد دوسرے اور تیسرے چوتھے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر خوف
مطلق نہیں ڈرنیکا نام تک نہیں لیتے الٹے حکومت کئے جاتے ہیں۔ ذرا
غور تو کیجئے کہ یہ ہے کیا بات، کاش مولانا عبدالماجد اس طرف توجہ فرماتے
یا کم از کم پروفیسر سراج الدین صاحب شمیم کو تو ضرور متوجہ ہونا چاہئے۔

ایک صاحب جو میرے مخلص ہیں بیوی کے گھر پر رہتے ہیں۔ اسی کا
مال کھاتے ہیں۔ مگر اس حکومت اور شان کیساتھ کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ سالن
میں نمک زیادہ ہو جائے تو دسترخوان الٹ دینگے۔ مارے چیخوں کے گھر سر پر

اٹھالیں گے۔ پان میں چونا بڑھ جائے تو سر کھا جائیں گے۔ بچّی کے ہاتھ میں مٹھائی نظر آئے تو خود جھپٹ لیں گے۔ اور اگر وہ روئے تو ڈپٹ کر بڑھادینگے۔ ان حضرت کا نام بدمذاقوں نے "ماٹھو" رکھا ہے مگر انکی شان اس سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے

ایک بزرگ اپنے خسر کا مال نہایت ہی بیدردی سے صرف کرتے ہیں جب کبھی ضرورت پڑتی ہے بے تکلّف اپنی رفیقۂ حیات سے کہلوا کر منگوا لیتے ہیں مگر ان کا سیدھا ہاتھ ہمیشہ نیک بخت کی چوٹی ڈھونڈھتا رہتا ہے اور الٹا ہاتھ گال۔ کئی مرتبہ موقع واردات پر ہمیں بھی پہونچنا پڑا ہے۔

اور ایک حضرت بیوی کا جہیز اور زیور وغیرہ اپنے شوق و ذوق کی نذر کر چکے ہیں۔ بیچاری کو اسیقدر وقعت دیتے ہیں جتنی کہ ایک سیول سرجن گاؤنکی دایہ کو اور بھی اکثر اصحاب اسی قبیل کے ملتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا بات ہے۔ ان رموز و غوامض کا پتہ اُسوقت چل سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستانکی مردم شماری اسطرح کیجائے کہ "ڈرنے والے مرد" اور "نڈر مرد" علیحدہ علیحدہ شمار کرلئے جائیں اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ڈرنیوالے انہیں پانچ طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں یا کیا۔ اور نڈر کتنے طبقوں پر منقسم ہیں۔ کم از کم ایسے مردوں کے دماغ خرید لئے جانے چاہئیں۔ تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ انمیں کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہے یا ان کے دل و جگر کا معائنہ کیا جانا چاہئے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ ایک نڈر کا دل ایک ڈرنیوالے کے دلسے کتنے گز لمبا یا چوڑا ہوتا ہے اور اسیطرح نڈر اور ڈرنیوالی

صنف نازک کے دل و دماغ کا معائنہ کیا جائے تو امید ہو سکتی کہ ہم کسی صحیح نتیجہ پر پہونچیں۔

یا شادی شدہ لوگوں کا ایک کلب قائم کیا جائے اور سارے ہندوستان میں اسکے ماتحت ایک ایک کلب قائم ہو تو کچھ پتہ چلیگا کہ یہ ہے کیا بلا۔ اگر موقع ملے تو یہ مسئلہ مجلس منتظمہ میں پیش کیا جائے گا۔ اور فیصلہ سے متعاقب اطلاع دیجائیگی۔



عطردان

"اپنا ولایتی عطردان دے دیا ہوتا۔ سینٹ کی شیشی دیدیتے۔ میرا عطردان کیوں دیا۔ تم کو میری چیزوں سے اتنی دلچسپی کیوں؟ اتنی دشمنی کس واسطے؟ بغض کس لئے؟ میں نے غلطی کی۔ ہاں ہاں مجھ سے غلطی ہو گئی۔ عطردان اندر سے بھجواتی ہی نہیں تو کوئی کیوں لیجاتا۔ مجھے کیوں ترسنا پڑتا۔ اپنا اچھا خاصہ عطردان دیکر کیوں روتی۔ تم کو کیا تمہیں فکر کس بات کی۔ کسی نے مانگا اور تم نے دیدیا یہ تو کہو غیروں کے مال پر دیدے لال کرنے والے تم کون"؟

زہرہ بیگم دالان میں بیٹھی ہوئی کڑک رہی تھیں۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ سارا بدن غصہ سے کانپ رہا تھا۔ بڑی بچی حیرانی سے منہ تک رہی تھی۔ بچہ اپنے ربڑ کے کبوتر کو دونوں ہاتھوں سے دبائے ہوئے کھڑا تھا۔ کبھی اپنی ماں کی صورت غور سے دیکھتا کبھی باپ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا اور کبھی بہن کو دیکھکر خاموش ہو جاتا۔ عابد صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ میں سگرٹ تھا۔ مگر وہ پی نہیں سکتا تھا

غصہ، شرم، خجالت، نفرت، مختلف جذبات اس کے دل و دماغ کو متاثر
کر رہے تھے۔ چہرہ بالکل زرد تھا۔ وہ محسوس نہیں کرسکتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے
زہرہ بیگم کی زبان چل رہی تھی۔ اور وہ پر جوش لہجہ میں مسلسل تقریر کر رہی تھیں۔
"میں کہتی ہوں وہ مسافر تھے تو مسافروں کی طرح رہتے۔ چھ آنہ کی سینٹ
کی شیشی خرید لیتے۔ چار شیشیوں والا عطردان لے لیتے کیا انہیں دو روپیہ بھی
نصیب نہ تھے تم دوست ہی تھے تو ایک عطردان منگوا دیا ہوتا۔ میرا عطردان
انہیں دینا کیا ضرور تھا۔ اجی وہ قائم مقام ہو کر آئے ہیں یا منصرم، تنہا ہوں
یا زنانہ کے ساتھ۔ عید کو گھر جانے کی چھٹی ملے یا نہ ملے مجھے اس سے کیا کام مجھے
کیا واسطہ۔ میرا عطردان انہیں کیوں دیا جائے مجسٹریٹ ہو کر آئے کہیں سے
دو روپیہ کا عطردان تک نصیب نہیں اور سنو کہیں سے چار آنہ تولہ کا عطر بھی
میسر نہیں آیا۔ میرا بھرا بھرایا عطردان لیگئے۔ ایسا ہی لیجانا تھا تو خالی عطردان
لیگئے ہوتے۔ میں نے پرسوں ہی تو عطر منگوایا تھا۔ سولہ روپیہ تولہ والا عطر
کبھی انہیں نصیب بھی ہوا ہوگا؟ دو دن اور صرف دو دن کیلئے، واہ اچھے
آئے عطردان مانگنے۔ میں پوچھتی ہوں آخر مجھ سے دریافت کیوں نہ کر لیا۔ اپنا
عطردان کیوں نہ دیدیا۔ میرے عطردان سے کیا خصوصیت تھی باہر بیٹھکر لگے
حکومت کرنے۔ عطردان منگوایا میں نے یہ سمجھ کر بھجوا دیا کہ کسی کو دکھائیں گے۔
بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ کوئی ڈاکو آیا ہے وہ لے ہی جائیگا۔"

"یہ عطردان باواجان نے کریم نگر میں خاص طور پر بنوایا تھا۔ جالی کا کام کتنا عمدہ تھا۔ اندر کی مخمل کی گدی "مس پر پرا" نے لگائی تھی۔ کتنا عمدہ مخمل تھا اسپر گوٹ کتنی اچھی تھی۔ ماموجان نے کتنے دنوں کے تقاضے کے بعد اس پر سونیکے پھول لگوائے تھے۔ پہلے وہ تین شیشیوں کا تھا۔ مگر میں نے چچا ابا سے کہکر بڑی شیشی منگوائی۔ انہوں نے بمبئی سے لادی تھی۔ کتنی اچھی شیشی تھی پورے چار تولے عطر کی تھی۔ اس پر طلائی کام کتنا اچھا تھا۔ مگر ہی وضع کی ایسی شیشیاں ملتی کہاں ہیں۔ اندر کا آئینہ کتنا خوبصورت تھا۔ اکبر نے اس پر بیل بوٹے بنائے تھے۔ میرا نام بھی اسی نے کھدوا تھا۔ جب ان لوگوں کو معلوم ہوگا تو وہ برا نہ مانینگے؟ انہوں نے ایک چیز شوق سے لادی تھی۔ ان کا تحفہ بھلا میں کسی کو کیوں دیدے چلی تھی۔ مگر تم نے خیال تک نہیں کیا۔ تم کو اسی عطردان سے اتنی خصوصیت کیوں تھی۔ اپنا ولایتی عطردان چھ شیشیوں والا دیدیا ہوتا۔"

"کوشلیا کی تصویر انلارج کرنے کو دی نے گیا ابتک لارہا ہے۔ ہوئی یا نکی ڈبیہ کی بھی کچھ حقیقت ہے وہ بھی ایک صاحب مانگ لیگئے۔ کتابیں سینکڑوں چلی گئیں ابتک واپس آرہی ہیں۔ ایسے دوست بھی کسی کے ہونگے۔ جو لیگئے لیگئے واپسی کا نام تک نہیں۔ وہ بیچارہ عطردان الگ لیگیا۔ آخر میرے بھی لڑکیاں ہیں۔ مجھے بھی اپنی لڑکی کا جہیز جوڑنا ہے میں تار تار کر کے جوڑوں و تم لوگونکے حوالے کردو، داماد آئیگا تو منہ پر نہ تھوکے گا؟ نواب کے بیٹے خود جاگیردار

پھر مہتمم پانچسو روپیہ تنخواہ اور جہیز میں بیٹی کو کیا دیا، چند انگریزی رسالے۔ دو چار پرانی کتابیں۔ چند تصاویر۔ بس یہی کائنات بھلا ایسے شخص کی بیٹی کون بیاہیگا؟

"کل عید ہے نواب زین الدین خاں کی بیوی ضرور آئینگی۔ ناظم صاحب کی بہن کا آنا لازمی ہے۔ تعلقدار صاحب کی بیوی کو میں نے دعوت دی ہے اور سب عورتیں آئینگی۔ تمہارے دوستونکی سب بیبیاں آئینگی۔ انہیں کیا دونگی وہ عطردان نہ دیکھ کر کیا خیال کرینگی۔ حضرت عباسؑ کی قسم میں تمہارے عطردان کو ہاتھ نہ لگاؤنگی۔ اس کی چھاؤں تک نہ دیکھونگی۔ اس کو اندر نہ لانے دونگی۔ اپنا اچھا خاصہ عطردان دیکر لوگوں کا عطردان میں کیوں لوں۔ مجھے کیا غرض پڑی ہے۔ سب آئینگی اور یوں ہی چلی جائینگی۔ کسی کو عطر نہیں ملیگا وہ کیا خیال کرینگی۔ یہی نا بدنامی ہوگی۔ ہونے دو۔ تمہارا ہی نام بدنام ہوگا۔ تمہیں کچھ تو سزا ملنی چاہیئے۔ تم ایک دن گھر لٹا دوگے۔ ان دوستونکے پیچھے برباد ہوجاؤگے بچی کے ایرنگ ٹوٹے پڑے ہیں۔ تین دن سے کہہ رہی ہوں مگر کوئی سنتا نہیں۔ تمہیں بچی کی کیا فکر۔ تمہیں گھر کا کیا خیال۔ تم کیوں یاد رکھوگے تمہیں کلب کی فکر رہے گی۔ تمہیں دوستوں کا خیال رہے گا۔ عید آئی تو عطردان اور وہ بھی لوگوں کا بے مانگے بلا پوچھے دیدوگے تمکو بچی سے کیا واسطہ کیوں خیال رہنے لگا اگلے سال وہ آئے تھے کوئی خان بہادر غنیمت یہ کہ انہیں رہنے کو مکان مل گیا۔ بیچارے نے دو آنے کا تو دو پیسے کا چمٹا تک نہیں خریدا ہمارے

گھر سے تو گیا۔ میرے جہیز کا ڈنر سٹ کتنا نفیس تھا رکابیوں پر حضور کی تصویر کتنی اچھی تھی۔ سب پھوٹ پھاٹ کر رکابیوں کے چار ٹھیکرے دو ڈش ہی تو رہ گئے تھے۔ خان بہادر نے وہ تیس مار خانی دکھائی کہ اسمیں سے بھی دو رکابیاں ایک ڈش توڑ کر بھیجا۔ ایسا ہی کوئی پاپڑ توڑ کر خان بہادر بنے ہونگے اے تم نے قدر دانی نہیں کی صاحب سے کہکر اب بھی کوئی اے بی۔ سی ڈی کا خطاب و لا دیا ہوتا۔ آخر تین برتن شہید کئے تھے۔ کوئی ٹھٹھا مذاق نہ تھا میرا سٹ خراب ہو گیا تمہاری جوتی سے۔ میری رکابیاں پھوٹ گئیں تمہاری بلا سے میری ڈش ٹوٹ گئی تمہیں پروا نہیں ہوئی تمہیں فکر تو بس دوستوں کی ہے میرا عطر دان اٹھا کر دے دیا۔ اب کی دفعہ کوئی چیز دیکر تو دیکھو علمبردار کی قسم تمہارا کالا ڈریس فقیر کو دیدونگی۔ بلٹ باؤلی میں نہ پھنکوا دیا تو زہرہ نہ کہنا کرچ کو چولھے میں نہ لگا دوں تو سہی۔ آخر کوئی حد بھی ہے۔ دیکھو نا اچھا خاصا عطر دان اٹھا کر دیدیا۔ اب وہ ضرور واپس کرینگے۔ یقیناً لا دینگے۔ گر پڑ کر چنخنے کا نہیں بے احتیاطی سے آئینہ بھی نہیں ٹوٹے گا۔ مخمل پر عطر کے دھبے کبھی نہیں گرینگے۔ شیشی واقعی سلامت آئیگی۔ عطر تو خرچ ہی نہ ہوگا،،

"اس مردوے سے عطر تک خریدا نہ گیا۔ اسی منہ پر تم کہہ رہے تھے علیگڈھ کالج کے بی اے ہیں۔ مجسٹریٹ ہو کر آئے ہیں۔ جوبلی میں ملاقات ہوئی تھی بڑے شریف ہیں۔ اللہ اللہ علیگڈھ کالج کے بی۔ اے عطر دان ہی مانگتے پھرتے ہونگے۔

مجسٹریٹ ہو کر آئیں بھی تو عطرداں مانگینگے۔ جوبلی میں بھی کسی کا عطردان چرائے
گئے ہونگے۔ شریف آدمی جوتے تھوڑا ہی چراتے ہیں۔ صرف عطردان مانگ لیجاتے ہیں"

عابد کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔ وہ بدقّت اُٹھ کر اپنے
ڈرائنگ روم تک پہنچ سکا۔ وہاں بھی اسے اپنی بیوی کی آواز صاف سُنائی
دے رہی تھی۔ وہ آرام کرسی پر بلاارادہ بیٹھ گیا۔ خود بخود پاؤں سیدھے ہوگئے
اور پیٹھ کرسی سے لگ گئی۔ اُسے نیند آگئی اور خواب دیکھنے لگا کہ دنیا ایک
بہت بڑا عطردان ہے۔ آسمان آئینہ بنا ہوا سر پر ہے۔ بڑے بڑے پہاڑ
مخمل کی گدّی معلوم ہو رہے ہیں اور وہ کمرخی شیشی بنا ہوا بیچ میں بیٹھا ہوا ہے۔

خوب صاحب! بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ لعاد

بدحواسی

حضرت آزاد[1] بھی عجیب بزرگ ہیں، چونکہ ہم سے خلوص ہے اور ہماری مالی حالت سے واقف ہیں۔ اسلئے اکثر ہمارے فائدے پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیتے ہیں۔ آج مکتبہ[2] میں بیٹھ کر آپ نے بکمال متانت "معاوضہ مضامین" پر گفتگو شروع کی دیر تک نصیحت فرماتے رہے کہ معاوضہ لیکر مضامین لکھو ہم اس کے خلاف ہیں نہ تو ہم اردو پریس کی حالت اتنی اچھی پاتے ہیں کہ وہ معاوضہ دے سکے اور نہ ہم "بہ ایں مفلسی" اس قدر گئے گذرے ہیں کہ معاوضہ لیں بہرحال دیر تک مباحثہ ہوتا رہا، لوگ مدلل اور غیر مدلل تقریر پر غور نہیں کرتے گرج دار آواز، تیز و تند لب و لہجہ، اور بھاری بھرکم الفاظ سے بہت مرعوب ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح ہماری مدلل مگر ضعیف و ناتوان، منحنی، تقریر پر کسی نے

---

[1] محمود مرزا خاں صاحب آزاد۔

[2] مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

کان ہی نہیں دیا، خدا رکھے جناب آزاد ہیں بھاری بھر کم مردِ متین، الفربہ خواہ مخواہ بھلے آدمی، آواز گرج دار لہجہ تیز و تند، توند کا پھیلاؤ، ہاتھوں کا بڑھاؤ، مونچھوں کا رعب، یہ سب چیزیں اِن کے ساتھ تھیں۔ عبدالرحمٰن صاحب بھی اپنی کی گانے لگے۔ اور تصدق حسین صاحب بھی ساتھ ہو گئے۔ بیچارے عبدالحق صاحب[1] کبھی کبھی ہماری کمزور، ناتوان، ضعیف، زار و نزار رائے سے اتفاق کر لیتے مگر دل سے نہیں۔ صرف آزاد صاحب کو ستانے! دو گھنٹے یہی دردِ سری رہی معلوم نہیں اپنے مقصد میں کون کامیاب رہا۔ مگر ہم گھر پہونچکر اس خیال میں محو ہو گئے کہ میدان ہم نے مار لیا اور حضرتِ آزاد بھی یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ انہوں نے جتیا وہ تو کہا ہے ناکہ، ہر کس بخیال خویش خبطے دارد،

فطرت نگار مہاشے سدرشن بڑے گپیّ ہیں انکی گپیں (افسانے) بہت مقبول ہیں ہم آتے آتے ایک جلد لیتے آئے تھے۔ کھانا کھا کر لگے مطالعہ کرنے سدرشن جی نے خوب افسانے لکھے ہیں "بہارستان اور چندن" دونوں کو ہم نے دیکھا نو بجے سے دو بجے تک کرسی پر پڑے دیکھا کئے۔ جب دونوں کتابیں ختم ہوئیں تو ہم نے ان پر تنقید شروع کی "محبوبۂ فرعون" بڑی عمدہ گپ تھی ہم اسکی تعریف میں اس قدر رطب اللسان ہوئے کہ تین بج گئے ساڑھے تین بجے رات کو الارم بجا ہماری نیک بخت برابر کے کمرے میں سو رہی تھیں شاید بیدار ہوئیں تو ہمیں

[1] جناب محمد عبدالحق صاحب ڈائرکٹر و منیجر مکتبہ ابراہیمیہ

پہلو میں نہ پایا بس پھر کیا تھا برس پڑیں آگ لگے ان کتابوں کو اور خدا کی سنوار اس مطالعہ پر ساڑھے تین بج گئے مگر آپ ابھی مطالعہ فرما رہے ہیں، افیونی کی افیون چھوٹ جائے، حافظ کی نماز قضا ہو مگر آپکے ہاتھ سے کتاب نہ چھوٹیگی ایسے کتابوں کے رسیا دیکھنے میں نہیں آئے۔ آدمی کیا جھینگر ہیں کہ دن بھر کتابیں چاٹا کرتے ہیں۔"

ہم نے سگرٹ جلالیا اور دونوں ہاتھوں سے لگے میز پر طبلہ بجانے مگر گراما فون چلتا رہا۔ ہزاروں صلواتیں اڑیں، سینکڑوں پھبتیاں کسی گئیں مگر ہم ٹس سے مس نہ ہوئے، آپ شاید ہم کو صرف "رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور "جامعہ معارف" ہی کا ممبر تصور کرتے ہیں۔ اجی حضرت! اس کے علاوہ بھی ہم کو ایک اور اعزاز حاصل ہے وہ یہ کہ ہم "ماموں زاد ایسوسی ایشن" کے ممبر یعنی "ماموں زاد بہن کے شوہر ہیں۔" اور وہ بھی "نان رسی ڈونٹ" یعنے اپنے گھر پر بیوی کو رکھنے والے نہیں۔ "رسی ڈنٹ ممبر" یعنے "خانہ داماد" ہیں اس اعزاز کے ہاتھوں ہم آئے دن پریشان رہتے ہیں۔ ہماری عزت سسرال میں اوسیقدر ہے جس قدر سائمن کمیشن والوں کی ہندوستان میں!

"وہ" صلواتیں سنا کر چلی گئیں، ماماؤں اور چھوکریوں کو پکار پکار کر جگایا۔ اور لگیں بیچ صحن میں کھڑی ہو کر چیخنے، چلانے، ممانی نے انگڑائی لی، ماموں لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھتے ہوئے اوٹھ بیٹھے، بچے بوڑھے سب ہی

جاگ پڑے، کھانسنے، کھنکارنے کی سُریلی آوازیں ہماری سامعہ نوازی کرنے لگیں، ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ جاکر چارپائی پر لد گئے اور رضائی اوڑھ لی اور روزے کی فلاسفی، تراویح کی برکت نماز کی ضرورت کو سوچتے ہوئے سو گئے خبر نہیں کتنی دیر سوتے رہے دیکھتے کیا ہیں کہ وہ نہایت ہی پیار سے گلے میں باہیں ڈال کر کہہ رہی ہیں "دیکھو تم روزہ نہ رکھو" مگر اسی وقت ہماری ران میں درد ہونے لگا آنکھیں کھلیں تو "وہ" کھڑی نظر آئیں اور اسی دلگداز آوازمیں سحری کی دعوت دے رہی تھیں، اللہ کتنا اچھا خواب تھا، واقعہ تو یہ ہے کہ وہ خواب ہی میں کچھ اچھی طرح ملتی ہیں۔ ورنہ ظاہرداری کو کیا کہوں بقول حسن بن صباح کے ہر ظاہر کا ایک باطن ہے، ہماری ظاہرداری کے باطن وہ خواب ہیں جو رات بھر ہمیں نظر آتے ہیں جن میں ہماری نیک بخت بڑی خیرخواہ نظر آتی ہیں اور نہایت ہی محبت سے ملتی ہیں، ورنہ ظاہر میں تو سیدھے منہ بات تک نہیں کرتیں، ہم اوٹھ بیٹھے جلد جلد منہ دھویا تھا ورنے دستر خوان بچھا دیا، ابھی ہم بال ٹھیک کر رہے تھے کہ نیک بخت نے دستر خوان پر دہا وا بول دیا اور لگیں چیخنے اجی! کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے سحر تو کر لو، پھر دن بھر بن سنور لینا' اب آپ کون سے سدّی منہر بازار جا رہے ہیں جو اس قدر بناؤ چناؤ ہو رہا ہے بیچاری عورتیں بناؤ سنگار کیلئے بدنام ہیں مگر مردوں کو کوئی کہتا نہیں۔

ڈاڑھی ہی بنانے میں دو گھنٹے لگا دینگے آدھے گھنٹے تک مونچھیں

برابر کریں گے، پھر کریم ملنے کو ایک گھنٹہ لیں گے، پوڈر کو پندرہ منٹ ضرور لگیں گے۔ منہ دھونے بیٹھیں تو خیر سے ایک گھنٹہ صرف کریں گے پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہوئے بال پونچھ رہے ہیں اس سے فارغ ہوئے تو لگے بال سنوارنے اللہ اللہ بالوں کی خاطر تو گھنٹوں تک زحمت اٹھائیں گے تم لوگوں کی مانگ سیدھی ہونے تک ہماری کھجوری چوٹی تیار ہو جاتی ہے۔ مگر پھر بھی ہم بدنام ہیں۔ چھوڑو بھی بناؤ سنگار عورتوں ہی کو زیبا ہے اور پھر ان عورتوں کو جو ہوائی دیدہ ہوں یا بازار کی بیٹھنے والی ہوں۔ ہم نے تو شریف گھرانے کی بہو بیٹیوں کو کبھی بنتے سنورتے نہیں دیکھا"

یہ باتیں سنکر ہم آگ ہی تو ہو گئے مگر کرتے کیا ع برسرِ دامادِ آدم ہرچہ آید بگذرد، کہکر کنگھا رکھ چھوڑا، برش پھینک دیا تو ال کندھے پر ڈالکر دسترخوان پر آ بیٹھے۔ بھوک تو خاک نہ تھی مگر تھوڑا بہت زہر مار کرکے اٹھ کھڑے ہوئے میز پر "مرزائی کوک شاستر" یعنے "بہشتی جھومر" رکھی ہوئی تھی اسی کو دیکھنے لگے مرزا صاحب پر بہت غصہ آیا کہ انھوں نے کتاب بعد از وقت لکھی کاش یہ کتاب ہماری نیک بخت کے بچپن میں لکھی جاتی اور وہ بچپن ہی میں اسے پڑھتیں کچھ نہ کچھ اثر تو ہوتا اور ہمکو ذرا اطمینان تو حاصل ہوتا۔ مگر مرزا جی نے بدقسمتی سے لکھی بھی تو کب جبکہ خیر سے وہ دو بچوں کی ماں ہو چکیں تھیں، اور ہم دی بھی تو کب جبکہ "وہ" لڑنے میں طاق، اکڑنے میں شہرۂ آفاق، جھگڑنے میں مشاق

ہو چکیں تھیں۔ اس وقت یہ کتاب کیا فائدہ پہونچاتی وہ تو کہاہے نا!

چوب تر را چناں کہ خواہی پیچ

وہ کھا چکیں تو چائے بنائیں مگر اتنی توفیق نہ ہوئی کہ پیالی ہماری طرف بڑھا دیتیں، کالی کلوٹی بجنا وہ نے پیالی ہمارے سامنے رکھدی اور ہم نے پہلا گھونٹ پیا، چائے ایسی تھی مگر اپنی تین صفتوں یعنے لب بند، لب ریز، لب سوز، میں صرف درمیانی صفت سے بھری ہوئی تھی۔ شکر تو نام کو نہ تھی اور اس قدر سرد تھی کہ آگے چلکر شربت بادام کا گمان ہونے لگا تھا۔ مگر کرتے کیا شکر مانگنا دوسرے معنی میں انہی ہونے کا اعلان کرنا تھا۔ اور ٹھنڈی ہونے کی شکایت کرنا گویا شامت بلانی تھی، بھلا اب کس کی ہمت تھی جو انکی دلچسپ تقریر سنتا ہم نے "یہ از شیر مادر" سمجھکر اسی پیالی کو ختم کیا، اور سگرٹ جلالیا بدنصیبی سے پان بھی نہیں نصیب ہوا۔ مانگنا ہماری وضعداری کے خلاف تھا۔ کرسی کے نیچے لونگ پڑا ہوا نظر آیا۔ ہم نے اس کے قریب سگرٹ گرا دیا اور پھر جھک کر سگرٹ کے ساتھ لونگ بھی اٹھالیا، اور لگے چبانے۔

"وہ" جاکر اپنی والدہ کے پاس بیٹھی رہیں، ختم سحر کی توپ دغی، کلیاں غرارے، شروع ہوئے، دیر تک وہ متبرک آواز آتی رہی اوّل کلمہ طیب کی گونج سنائی دیتی رہی مگر ہم سگرٹ پر سگرٹ جلاتے رہے۔ واقعی اسپورٹس مین ہوتا بھی اچھا سگرٹ ہے۔

صبح کے چھ بجے وہ کمرے میں آئیں تو ہم نے سگرٹ پھینک دیا اور لگے "تذکرۂ اولیاء دکن" دیکھنے انہوں نے تیکھی چتوں سے ہماری طرف دیکھا اور اور جاکر چارپائی پر دراز ہوگئیں، دو منٹ کے انتظار کے بعد ہمنے سگرٹ جلا لیا اور لگے نظام گزٹ کیلئے گپ لکھنے ابھی ایک صفحہ بھی نہ ہوا تھا کہ پردہ ہٹا اور وہ برآمد ہوئیں ہم نے لاکھ چاہا کہ سگرٹ چھپالیں مگر ممکن نہ ہوا، دھوئیں نے بھانڈا پھوڑ دیا اب کیا تھا اُف......! اچھا آپ میں یہ عادت بھی ہے شرم نہیں آتی۔ ہمارے ساتھ سحری ہوتی ہے ہمارے ساتھ افطار اور پھر آپ الگ الگ سگرٹ بھی اڑاتے ہیں میں سحر کر کے سو جاتی ہوں تو آپ سگرٹ پیا کرتے ہیں۔ اسی لئے تو دن بھر آپ گھر پر نہیں رہتے اللہ اللہ کیسے کیسے لوگ دنیا میں ہیں اللہ میاں کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور ہم کو بھی تُف ہے تمہاری زندگی پر لعنت ہے ایسی"...... ہم سمجھ رہے تھے کہ مارچ بینڈ بج رہا ہے اور بالاگھاٹ کی بے برگ و گیاہ وادیوں سے گذر کر راہ تیر کی چلچلاتی دھوپ میں ٹھیک بارہ بجے ہم ڈبل مارچ میں مصروف ہیں۔

جسوقت ہماری آنکھ کھلی تو دن کے ساڑھے تین بج چکے تھے، کمرہ کرۂ نار بنا ہوا تھا جسم پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا ہمارے برابر وحید الزماں صاحب ندوی فنا فی النوم تھے، سارا گھر سنسان تھا کبھی کبھی کسی کوے کی بے ہنگام آواز البتہ سنائی دیتی تھی، گھڑیال کی ٹک ٹک سخت وحشت انگیز تھی ہمنے سگرٹ جلایا منہ دھوئے بغیر شیروانی پہن لی گپ کا مسودہ جیب میں رکھا اور چلے "دفتر نظام گزٹ"

چارلی چپلن کا تماشہ

خدا جنت نصیب کرے والدِ مرحوم کو وہ فرمایا کرتے تھے کہ "انسان کی قسمت پھوٹتی ہے تو فوج میں نوکر ہوتا ہے" مگر یہ کلیہ ہماری نظر میں تو ذرا ٹیڑھا اترتا ہے بھئی ہم تو کہتے ہیں کہ "انسان کی قسمت پھوٹتی ہے تو گھر داماد ہوتا ہے"۔

خدا غارت کرے اس خانہ دامادی کو ہم نے دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھکر یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر ہم بھی خانہ داماد بن جائیں تو خوب گذرے گی۔ مگر لاحول ولا سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ "ماٹھو" پر ہم فقرے کستے تھے۔ عنایت خاں پر پھبتیاں اڑاتے تھے۔ تقریباً سب گھر دامادوں کی دُرگت بناتے تھے مگر ہمیں کیا معلوم تھا ایک روز ہم بھی گھر داماد بنینگے۔ اور گیدڑ کی طرح کیچڑ میں پھنس کر رہ جائینگے۔ ہائے

محاورہ

بڑا بول آگے آیا ہم جو بولے تھے لڑکپن میں

پرسوں ہم کو "چارلی چاپلن اِن گولڈ رش" دیکھنے کی سوجھی بعض احباب سے ملتے ملاتے تھیٹر پہنچے تو سات بج رہے تھے کھیل شروع ہو کر آدھ گھنٹہ گذر چکا تھا

ہم نے سوچا کہ چلو کسی اور جگہ بیٹھ رہیں۔ سیکنڈ شو دیکھ لینگے۔ اب جو آکر ملٹی رنٹورنٹ میں قیام کیا تو ملگئے حضرتِ سعیدی اور حضرت قریشی۔ حضرت آزاد وغیرہ۔ ساڑھے نو بجے تک علامہ سنلائٹ کا ذکر ہوتا رہا۔ حضرت کی خانگی ہسٹری بچوں کی لائف انکی مضمون نگاری۔ اور سرقہ شعاری۔ حوالہ نویسی غرض ہر چیز پر مکمل اور مبسوط لکچر دیا گیا۔ پھر ہم چلے طرف سینما کے۔

گو شدت کی بھوک تھی مگر چارلی چاپلن کے نام نے تھوڑی دیر کیلئے معدے کو بھی مرعوب کرلیا۔ دس بجے سے ہم نے سینما دیکھنا شروع کیا تو بارہ بھی بج گئے۔ اور ساڑھے بارہ ہوتے آتے خدا خدا کرکے ہال سے نکلے۔ بھوک سے یونہی برا حال تھا۔ چاپلن کی مضحک حرکات پر ہنس ہنس کر آنتوں میں درد بھی مول لیا اب جو سائیکل وصول کرنا چاہتے ہیں تو "سائیکل بان" یعنی محافظ سائیکل نے سائیکلوں کو ایک دیوار سے اس طرح جمایا تھا کہ پہلے کسی ایک شریف آدمی کی بائیسکل تھی۔ اس کے اوپر ہماری اور ہماری سائیکل کے اوپر پوری پچاس سائکلیں۔ ہر شخص آتا اپنا ٹکٹ دیتا۔ اور نمبر وار سائیکل لیجاتا۔ ہم نے شمار کرنا شروع کیا۔ ۵۲۔ ۵۱۔ ۵۰۔۔۔۔۔ ایک بجے کہیں نمبر ۲ آیا ہم نے جھٹ سے ٹکٹ پیش کیا اور سائیکل لیکر چلے گھر کی طرف رسی ڈلنسی کی موٹر پر ایک موٹر سے معانقہ کرتے کرتے بچے۔ گولی گوڑہ کے چمن کے پاس ایک سائیکل سوار سے گلے مل ہی لئے اور بھتھر گھٹی پر ایک لڑکے کو

۱؎ آرایش بلدہ کی ہوائے اب اس چمن کو اڑا ہی دیا۔

"ضربِ خفیف نہ شدید" بلکہ سائیکل کی ٹکر دیتے ہوئے چار مینار تک آ گئے۔
میداں خاں کے چوک کے کتے بھی غضب کے ہیں۔ جعفر علی کے تابوت کے پاس سے
جو ہمارا خیر مقدم شروع کیا تو بس کوٹلہ کے دروازہ تک پہنچا کر چھوڑا۔ خیر یہ گذری کہ
کوٹلہ کے والنٹیر بھی ہمارے منتظر ہی تھے۔ پہلے تو انہوں نے خوش آمدید کہا مگر
ہمارے پیچھے اس "والنٹیر کور" کو دیکھکر دست و گریباں ہو گئے ہم نے جو ایک
لانبا سانس لیکر سائیکل بڑھائی تو سیدھے گھر پر .... پھاٹک پر پہنچکر سائیکل
دیوار سے لگائی۔ کان دھر کر آہٹ جو لی تو رستم علی کے خرّاٹوں کی آواز سنائی
دینے لگی۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کڑک کر آواز دی "رستم علی رستم۔ رستم ایک سانس
میں تین دفعہ پکارا۔ تب کہیں رستم علی نے کروٹ لی اور اُسی پینک کی رسیلی آواز
سے پوچھا "کون ہے رے" ہم نے کہا "بھئی میں ہوں" خیر یہ گذری کہ حضرت
سمجھ گئے۔ جلدی سے کھولدیا پھاٹک ہم نے اندر آ کر دیکھا تو اندر کا دروازہ بھی
بند۔ اب کیا کرتے اگر آوازیں اور کچھ شور و شغب ہو تو زنانہ تک آواز جانے کا
اندیشہ رستم علی سے کہا کہ بھئی تم ہی کسی کو پکارو اور اپنے لئے کہکر دروازہ کھلواؤ
وہ غریب اِن خانہ دامادی کے جھگڑوں کو کیا جانے کڑک کر آواز دے ہی دیا کہ
"دلاور دروازہ کھولو دولہا میاں آ گئے" خیر دلاور نے دروازہ کھولا۔ ہمارے ہاتھ سے
سائیکل لی۔ اور ہم داخل ہوئے۔ اب جو ہم دیکھتے ہیں تو زنانہ دروازہ بند!
غضب خدا کا ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہم نے پہلے تو چار لی چاپلن کی شان میں

کچھ مغلظات کا استعمال کیا۔ پھر اُس سائیکل بان کو مخاطب کر کے کچھ سُنا یا سینما والے کو بھی نہ چھوڑا مگر فائدہ کیا تھا۔ آستین چڑھا کر سیدھے ہاتھ سے زنانہ دروازے کی کنڈی کھولنی چاہی۔ دیر تک کوشش کرتے رہے مگر ممکن نہوا دلاور کھڑا تماشا دیکھا کیا جب ہم نے ہار مان لی اور دروازہ کے پاس سے ہٹ گئے

تو اُس نے آگے بڑھکر ایک ذرا سے جھٹکے میں کنڈی کھول دی جھٹ سے ہم داخل ہو گئے اور آہستہ سے دروازہ کی کنڈی چڑھا کر اپنے کمرے کی راہ لی خیر یہ گذری کہ پاؤں میں کریب سول شوز تھا۔ آواز بھی نہ ہوئی کمرے میں آ کر شیروانی ٹوپی۔ شوز۔ پاتابے اُتارے۔ سگرٹ جلا کر سونے کے کمرے کو دیکھا تو بیگم صاحبہ نہایت ہی فراغت سے سو رہی تھیں۔ باہر آ کر نعمت خانہ ٹٹولا کہ کچھ بسکٹ کیک یا میوہ ہی مل جائے مگر سوائے خالی برتنوں شکر اور چاء کے کچھ ملا ہی نہیں۔ بھوک اس شدّت کی تھی کہ سر چکرا رہا تھا۔ ٹول پر پاؤں رکھ کر ہم نے سوچا کہ کیا کرنا چاہئے۔ مگر کوئی بات ذہن میں نہ آئی۔ بیگم کو جگانے کی ہمت نہ تھی۔ مجبوراً نجا اور کو ڈھونڈھا۔ بڑی دیر کے بعد پتہ چلا کہ وہ باورچی خانہ کے سامنے دالان میں ماؤں کے ساتھ سو رہی ہے مجبوراً پاؤں دبا کر وہیں پہنچ گئے جوانی کی نیندیوں ہی بُری ہوتی ہے اور پھر دن بھر کام کاج دوڑ دھوپ کر کے تھکنے کے بعد تو پوچھئے نہیں۔

کچھ ایسی سوئی تھی سونیوالی کہ جاگنا حشر تک قسم تھا

مونڈھا تھام کر دیر تک جھنجھوڑا۔ ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ مگر ہوشیار ہوا کیا معنی ظالم کروٹ بھی لینے کو تیار نہ تھی۔ آخر ہم نے تنگ آ کر ناک کے دونوں نتھنے ہاتھ سے پکڑ لیئے۔ سانس جو رکنے لگا تو اُسے کہیں ہوش آیا۔ چونک کر ادھر اُدھر دیکھ کر ہم سے مخاطب ہوئی اور خاموشی سے گھورنے لگی۔ ہم نے منہ سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ہاتھ پکڑ کر کھینچا کہ وہ اُٹھ کھڑی ہو تو آہستہ سے کھانے کیلئے کہیں مگر ادھر ہم نے ہاتھ کھینچا اور ادھر اُس نے ہاتھ جھٹک کر کسیقدر بلند بلند آواز میں کہا "واہ میاں راتوں کو آ کر جگانا کیا بات بیگم صاحبہ سننگی تو غضب ہو جائیگا جا کر سو رہیے"۔ ہم نے دبی آواز میں کہا "بختاور ذرا اُٹھ تو سہی" اب تو اُس نے اور بھی پاؤں پھیلائے لگی کڑکنے "واہ میاں واہ یہ بھی کوئی بات ہے" ہم نے دیکھا کہ معاملہ اگر بڑھے تو مشکل ہے خاموشی سے واپسی کی ٹھان لی۔ اُس کا ہاتھ چھوڑ کر چلے۔ اب جو پلٹتے ہیں تو دیکھتے کیا ہیں کہ بیگم صاحبہ ہمارے پیچھے پورے جلال کے ساتھ کھڑی ہوئی ہیں۔ چہرہ انگارے کی طرح سُرخ نتھنے پھولے ہوئے آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں۔ سینہ متلاطم سانس پھولا ہوا ہماری روح ہی فنا ہو گئی۔ کئی ایک آیتیں پڑھیں "جلّ تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کیا اور ڈرتے ڈرتے کہا "بیگم!" بس برس ہی تو پڑیں وہ وہ صلواتیں سنائیں ہیں کہ معاذ اللہ۔

مہوشوہر کوئی بیوی کے بس میں

اِس قدر گرجدار آواز تھی کہ سارا گھر جاگ اٹھا۔ ہم نے لاکھ لاکھ کوشش کی کہ کم از کم اپنے کمرے تک پہنچ جائیں مگر ممکن نہ ہوا۔ بیگم نے ایک قدم آگے بڑھنے نہ دیا۔ ماما ئیں۔ چھوکریاں۔ چھوکرے سب جمع ہو گئے۔ کسی نے یہ اور غضب کیا کہ جا کر ہماری سالیوں اور خوشدامن صاحبہ کو جگا دیا۔ بڑی بی بھی پہنچیں۔ اب گویا ہم ملزم بنے کھڑے تھے۔ ماما ئیں گواہ تھیں۔ بیگم صاحبہ مدعی اور ہم ملزم بڑی بی نے بختاور سے تفصیل پوچھی۔ ماماؤں سے گواہی طلب کی۔ بیگم صاحبہ کا بیان سُنا۔ مگر ہمارا ایک لفظ بھی سُننا گوارا نہ ہوا۔ خدا بھلا کرے ہماری منجھلی سالی کا اُس غریب نے سب کو ہٹایا۔ ہم سے پُوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے ہم نے بکمال معصُومیت آنکھوں میں آنسو بھر کر تمام تفصیل سنائی۔ اس بھولی بھالی لڑکی کو تو یقین آ گیا۔ مگر ہماری بیگم نے باضابطہ جرح شرُوع کر دی۔ سوال بندی تو ترتیب دے دیا کہ

(۱) اگر بہت بھوک لگ رہی تھی تو ہمیں جگا دیا ہوتا۔

(۲) ہم سے ایسی محبت تھی اور ہماری نیند خراب کرنا پسند نہ تھا تو کسی ماما کو جگا دیا ہوتا۔

(۳) آہستہ سے دبے پاؤں جا کر خاموشی سے بختاور کو جگانا اور اس کے بیدار ہونے پر ہاتھ پکڑ کر کھینچنا کیا بات تھی۔

(۴) اگر کوئی خاص بات نہ تھی تو دندناتے ہوئے آ کر آواز سے جگایا ہوتا۔

Ah ..... ha ... how? why?

اس قدر آہستگی اور کانا پھوسی کیا ضرور تھی۔"

(۵) "اپنا پمپ شوز نہ پہننا اور ہمارا سلیپر سونے کے کمرے میں سے لیکر پہننا کیا ضرور تھا۔"

(۶) "کندھے پر توال ڈالکر بختاور کے پاس آنا کیا بات۔ ورنہ غسل خانہ کو بھی خود توال لیجانے کی عادت نہ تھی۔"

(۷) "بختاور کو جگانے کے بعد بجائے کھانا لانے کے لئے کہنے کے اٹھنے کی فرمایش کرنا کیا بات؟"

(۸) "آواز دیکر جگانے یا جھنجوڑنے کے بجائے نتھنے پکڑکر جگانا کیسا؟"

(۹) "دلاور نے دروازہ کھولا تو اسی کو کھانا لانے کیلئے کیوں نہ کہدیا؟ بختاور کے پاس آنا کیا ضرور تھا۔"

یہ سوالات ایسے نہ تھے کہ ہم بلا کسی بیرسٹر یا جوڈیشل کامیاب وکیل درجہ اوّل یا ال ال بی، کی امداد کے جواب دیسکتے۔ ہم نے منجھلی سالی کے کمرے کا رُخ کیا اور اُسکی چارپائی پر گرکر اپنی معصومیت پر اشکباری شروع کی۔ سحر کی ٹھنڈی ہوا نے خالی معدے اور تھکے ہوئے دماغ کو کچھ اسقدر متاثر کیا کہ نیند آگئی۔

بوکھلاہٹ

گذشتہ صبح کو ہم سویرے ناشتہ کرکے گھر سے نکلے، ملتے ملاتے پھرتے پھراتے بارہ بجے مکتبہ ابراہیمیہ پہونچے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ عبدالحق سے گپ لڑائی اور پھر چلے طرف قطبی گوڑے کے، چونکہ ہم روزانہ دفتر جانے کیلئے آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ کرتے اور بڑی بے دردی سے خوب ڈٹ کر ناشتہ ہوتا تھا۔ اسلئے دفتر میں ڈیڑھ دو بجے تک بھوک نہیں لگتی تھی۔ مگر تعطیل کے روز چونکہ دوپہر کا کھانا گھر پر کھانے کا اتفاق ہوتا اس لئے ہم ناشتہ بھی ذرا معمولی اور یونہی سا بقدر بادام یعنی صرف ایک پراٹھا۔ آدھ پاؤ کھچڑی معہ سالن کھالیا کرتے تھے اور فقط ایک عدد پیالی پی جاتے اور سات بجے تک تیار ہو کر گھر سے چلے جاتے تھے اس لئے راستہ میں لگنے لگی بھوک ہم نے کہا آؤ ذرا چائے پی لیں، "بمبئی رسٹارنٹ" میں پہونچکر چائے پی کچھ بسکٹ کھائے اور پھر سائیکل سنبھالی تو سیدھے "حافظ جی" کے مکان پر جا ٹھہرے کئی روز کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔

ادہر اودہر کی باتیں، شکوے شکایت، طنز، چوٹ، مذاق، دلگی، سبھی کچھ ہوتا رہا حتیٰ کہ بج گئے ساڑھے چار! ہم نے سوچا کہ کھانے کا وقت تو گیا اب گھر جا کر کھانا کھائیں گے تو پوچھ گوچھ ہوگی کہ اب تک کہاں رہے دیر کیوں لگائی وقت پر کیوں نہیں آئے؟ لہٰذا اس سے بہتر یہی ہے کہ رات ہی کو گھر پہونچکر کھانا کھائیں اور دوپہر کے کھانے کے واسطے یہ کہکر ٹال دیں کہ عبدالحق نے مجبور کر کے کھانا کھلا دیا، یہی سوچکر ہم نے پانچ بجے بمبئی رسٹورنٹ میں چائے بھی پی لی اور پہونچ گئے مکتبہ ابراہیمیہ وہاں دیکھتے کیا ہیں کہ "مخزن کا افسانہ نمبر" اسٹال پر رکھا ہوا ہے اب جو خوشی خوشی ہم نے رسالہ لیکر دیکھا تو سب سے پہلے ہمارے مشترکہ ترجمے "ارسٹ" پر تنقید نظر آئی شروع سے اخیر تک پڑھ ڈالا ایک نہیں دو دو بار دیکھا اگر سوائے برائیوں کے اچھائیاں نظر ہی نہیں آئیں میاں[1] تاثیر نے فقط معائب ہی معائب گنائے تھے اور آخر میں یہ تاثر لکھ دیا کہ "کتاب تک پھینک دی" ہم نے کہا چلو یہی غنیمت کہ تاثیر صاحب نے کتاب پڑھ کر پھینکی بات دراصل یہ ہے کہ اردو مرکز والے اب ذرا سمجھنے لگے ہیں۔ اپنے تئیں "یا آپ نے سمجھے ہوئے ہیں"۔

آسکر وائیلڈ کی نثر انگریزی میں وہی درجہ رکھتی ہے جو میر انیس کی نظم کو اردو میں حاصل ہے اگر کوئی شخص میر انیس کے مراثی کا ترجمہ انگریزی

---

[1] محمد دین صاحب تاثیر، ایم، اے

میں کرے تو کیا اصل کا لطف باقی رہے گا؟ مطلق نہیں اطرز بیان کی ایک خصوصیت اور تشبیہ و استعارات کی لطافت ایک حد تک معلوم ہو سکیگی اور بس یہی حال اسکر وائیلڈ کے ڈراموں کا ہے اُدھر انہیں اُڑا دیا (اردو میں ترجمہ کیا) اور اِدھر لطافت غائب پھر آپ ہی کہئے ہم اصل کی خوبی کہانتک باقی رکھ سکتے تھے خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا مگر ہمیں مسرت ضرور ہوئی کہ تاثیر صاحب نے اس کا مطالعہ اصل کو پیش نظر رکھکر کیا ہے اس تنقید کو ختم کر کے افسانوں پر پہونچتے ہیں تو بس امتلا اور سخت امتلا شروع ہو جاتا ہے کوئی ناظمی صاحب خیر سے ایم اے بھی ہیں اور روسی افسانے کو ہندوستانی فضا میں ترجمہ کرتے ہیں۔ مگر واہ ری تاثیر "آپ بُرا تو نہیں منائیں گے" "اور تم جوان ٹھیرے ہرگز نہیں میں بھی خاموشی پسند ہوں یا تو نی ہرگز نہیں" میکسم نے امن کا سانس لیا کوئی بڑا جرم کیا ہے تم نے جو یوں خاموش ہر وقت ضمیر کی ملامتیں سنتے رہتے ہو، میں یہ کہکر خوشی خوشی بستر میں جا کودا "گم ہو جاؤ نہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا" رفیق اطاق" کیا کیا ترکیبیں گنواؤں بقول مرحوم مہدی کے "امتلائے ادبی" پیدا ہونے لگا۔ اور ہمنے یہ جملے سنائے مکتبہ ابراہیمیہ کے منیجر عبدالحق صاحب کو گو آدمی ذرا سیدھے سادھے ہیں اور فی الجملہ سادہ لوح بھی واقع ہوئے ہیں مگر ایک بات ضرور پتے کی کہی کہ "بھئی لوگوں کو اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ مگر دوڑتے ہیں دوسروں کی

آنکھ کا تنکا نکالنے ڈھائی صفحے کے ترجمہ میں ایک ایم اے نے معمولی جملوں کے لکھنے میں اتنی بدحواسیاں کیں مگر پروفیسر تاثیر یا حضرت حفیظ کو نظر ہی نہیں آئیں اور جو تم نے سوا سو صفحے کی ادبی ادق اور اہم کتاب کے ترجمے میں اگر غلطیاں کیں تو بس سر ہو گئے" ہمنے کہا میاں جانے بھی دو ایسا ہوا ہی کرتا ہے یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ حضرت مولوی محمد عبدالوہاب صاحب قبلہ ڈاڑھی کھجلاتے اور توند ہلاتے ہوئے آہی پہونچے پھر کیا تھا گپ شروع ہو گئی۔ اسی اثناء میں چراغ علی صاحب بھی ہانپتے ہوئے ہٹوا سنبھال کر آدھمکے اور طائفہ وزرائے عرب کے ارکان اربعہ نے وہ وہ گپیں اڑائیں کہ واہ میاں باقر علی داستان گو کی روح بھی شرما گئی ہو گی۔ اسی گپ بازی میں ساڑھے سات بج گئے، چراغ علی ٹھہرے "وہ" یعنی بمحاورۂ عوام زن مرید" سائیکل سنبھالکر سیدھے گھر کی طرف جاتے رہے اور ہمیں وہاب نے دعوت دیدی ہم نے بھی عبدالحق کے اصرار پر دعوت قبول کر لی اور چلے طرف نام پلی کے پیٹ بھر کھایا اور پھر لب بند، لب سوز، لب ریز، چائے پی اور ساڑھے آٹھ بجے واپس ہوئے۔ مالگزاری کے سامنے پہونچکر عبدالحق چلتے بنے اب صرف رہ گئے ہم دونوں یعنی وہاب اور راقم جانب! وہاب نے کھانا ہضم کرنے کی ترکیب یہ نکالی کہ شاہ[۱] صاحب کے پاس چلیں اور وہاں مرزا صاحب کے مزاج

---

[۱] شاہ عبدالقادر صاحب خلف نواب جعفر یار جنگ بہادر

پوچھیں ہم دل میں تو ڈر رہے تھے کہ نہ جانے، گھر جانے کے بعد کیا گت بنتی ہے
مگر ہمت کر کے شاہ صاحب کے پاس چلنے کی ٹھان لی اور وہیں پہونچے مرزا صاحب
پاندان لئے براجمان تھے۔ شاہ صاحب بھی تشریف فرماتے تھے، نظامی صاحب
بھی موجود تھے۔ ہمارے پہونچتے ہی جلسہ کاملہ مکمل ہو گیا اور سب ملکر پل پڑے
مرزا صاحب پر! مرزا صاحب کی مختصر تعریف یہ ہے کہ پرانی دلّی میں پیدا ہوئے
دیسی ریاستوں اور خاصکر رامپور میں جوانی گذاری اور پھر دکن آکر نوکری کر لی
ابتداً تلنگانہ میں رہے پھر حیدرآباد میں قیام فرمایا چار شادیاں کیں پہلی بیوی
میرزا صاحب سے ڈیوڑھی عمر کی چھ بچوں والی تھی جس وقت مرزا صاحب سے
نکاح ہوا تو اُن محترمہ کے بڑے صاحبزادے جو مرزا صاحب ہی کے ہم عمر تھے
تکمیل تعلیم کیلئے یورپ جا رہے تھے۔ دوسری شادی بھی ایک چار بچوں
والی ہی سے کی اور تیسری چوتھی بھی، میر منشی گیری رزیڈنسی سے لیکر آبکاری
کی داروغہ گیری، اور محبس (جیل) کی محرری تک کی مگر پاؤں میں چکر تھا کہیں
ٹکے نہیں سن شریف ستّر کے قریب ہے بال سفید ہو گئے ہیں جسم خاصا
بھاری بھر کم ہے رنگ بھی سرخ و سفید پایا ہے۔ خضاب لگا کر اب بھی مونچھ
چڑھائے پھرتے ہیں۔ اس حالت میں بھی جوانوں سے گئے گذرے نہیں۔
کسی بات کا تذکرہ ہو عینک سے جھانک کر خود بھی شریک ہو جاتے ہیں وہی
روز پہلے میرزا صاحب نے نواب معین یار جنگ کے پاس دعوت اڑائی تھی

اور اب بیٹھے اسی کا تذکرہ کر رہے تھے حق تو یہ ہے کہ حقِ نمک خواری ادا
کرتے تھے تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے ہم جو پہونچے تو ساری شیخی کرکری
ہو گئی۔ لگے بغلیں جھانکنے گو مذاق کرنا جانتے نہیں۔ مگر باِ مذاقوں کی صحبت
ضرور ملی ہے اور اسی برتے پر چند خاص خاص جملے بول بھی لیتے ہیں مگر ویہات
میں رہ رہ کر زباں اس قدر خراب ہو گئی کہ لاحول ولا قوۃ ، ساڑھے گیارہ
بجے رات تک سبھوں نے میرزا صاحب کو ستایا۔ بیچارے دن بھر کے تھکے
ہوئے افیون کھا کر سونا چاہتے تھے گھڑی گھڑی پینک میں چلے جاتے تھے
ادھر انھوں نے آنکھیں بند کر کے غوطہ لگایا اور ادھر سبھوں نے چیخا "بُرتی بُرتی"
جھٹ میرزا صاحب چونک پڑے اور لگے اناپ شناپ بکنے۔
ٹھیک بارہ بجے ہم ٹیلیفون ایکسچنج کے پاس پہونچے نہایت تیزی کیسا تھ
چلے جا رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی اب جو پلٹ کر دیکھتے ہیں تو
مولوی سردار علی صاحب مدیر رسالہ تجلّی سہ ماہی (جو تقریباً ایک سال سے
زیر اشاعت اور آدھے سے زیادہ لکھا جا کر رکھا ہوا ہے[1]) ڈنڈا ہاتھ میں لئے
جھومتے ہوئے آرہے ہیں مولوی صاحب اتفاق سے ہمارے استاد بھی
واقع ہوئے ہیں اور والدِ مرحوم کے شاگرد بھی اور پھر علمی ادبی آدمی بھی اب
اگر ہم نہ ٹھہرتے تو مشکل تھی مجبوراً سائیکل سے اتر کر ملنا پڑا ، ادبی دنیا ، نیرنگ خیال ،

[1] افسوس ہے کہ رسالۂ تجلّی کا یہ آخری پرچہ تھا اس کے بعد قصہ ہی ختم ہو گیا۔

نگار، سے لیکر معارف تک کے متعلق آپ نے پوچھ لیا اور پھر پیک سائنس رہبر دکن، مشیر دکن، صحیفہ، صبح دکن، نظام گزٹ، وکن گزٹ[1]، دکن پنچ سے لیکر الحمایتہ تک کے متعلق فرما دیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے رسالے کی اشاعت کا تذکرہ، کاپی نویسوں کی شکایت مطبع کی مذمت بھی فرماتے رہے بہرحال گول بنگلہ سے سوکھے حوض تک حضرت نے خراماں خراماں چلتے ہوئے دنیا بھر کی باتیں کیں اور پھر کچھ نہیں ہمنے انہیں رخصت کر کے چار مینار کی گھڑیال پر نظر ڈالی تو چھوٹا کانٹا بارہ اور ایک کے درمیان میں نظر آیا اور بڑا کانٹا فقط دس پر یعنے ایک بجنے کیلئے صرف دس منٹ باقی تھے، ہمنے سائیکل پر سوار ہوکر بھاگنا شروع کیا تو سیدھے گھر پہونچ کر دم لیا۔ پھاٹک کے سامنے سائیکل کو دیوار سے ٹیکا دیکر کھڑا کر دیا اور بڑی دقت سے ہاتھ ڈالکر پھاٹک کھولا مگر ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑیال کا آئینہ شہید ہو گیا اور اندر جا کر پھاٹک بند کیا اور دیوان خانے کے دروازہ کو بھی ہاتھ ڈالکر کھولنے کی کوشش کی بڑی دقت کے بعد دروازہ کھلا اور ہم نے دالان میں سائیکل رکھکر جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو، پڑھتے ہوئے دبکتے دبکاتے ڈرتے سہمتے اندر کا رخ کیا، صحن میں پہنچکر دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے کمرے میں خاصی روشنی ہے چراغ جل رہا ہے بیگم صاحبہ لکھنے کے میز کے سامنے بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی ہیں بس ہمارے اوسان ہی

---

[1] یہ روزنامہ بھی چند ہی دن جاری رہ کر بند ہو گیا۔

خطا ہو گئے۔ ہمنے کہا کہ آج خیر نہیں۔ پھر یہ سوچا کہ آہستہ سے پیچھے جا کر دونوں
ہاتھوں سے آنکھیں بند کر دیں گے۔ اس مذاق ہی سے سہی مگر ذرا غصہ تو ٹھنڈا
پڑیگا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ پاؤں میں ایڑی دار شوز تھا۔ ہم نے اس خیال سے کہ
آواز ہو گی اس کو اُتار کر صحن ہی میں چھوڑ دیا اور ننگے پاؤں دبکتے دبکتے کمرے کے
پچھلے دروازہ سے داخل ہونا چاہا، ہائے دنیا کی بدترین چیز موز ہے صورتاً برا
مزا خراب، خاصیت خراب، مضر صحت، قابض، جانے کیا اور کیا اور پھر اس
بُرے میوے کے چھلکے (پوست) بھی تکلیف دہ! نہ جانے کس نے موز (کیلے)
کھا کر سیڑھیوں پر چھلکے (پوست) پھینک دیئے تھے کہ ہمارا سیدھا پاؤں
اسی پر پڑا اور ابھی ہم سنبھلنے نہ پائے تھے کہ دھڑام سے دروازے میں گر پڑے
پردا لٹک رہا تھا بد حواسی میں ہم نے اسی کو تھامنا چاہا تو وہ بھی سر پر آ رہا۔
اب ہماری ہئیت کذائی ایک گٹھری سی بن گئی اور ہم پردے میں لپٹے لگے لوٹنے ادھر
جو بیگم صاحبہ نے دروازہ میں سے کسی گٹھری کو گر کر حرکت کرتے دیکھا تو انکے
ہاتھ پاؤں بھی سرد ہو گئے، زور سے چیخ کر دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے ادھر
چیخ کی آواز پر سب لوگ جاگ پڑے، بجتا ور ایک طرف سے دوڑی۔ انا بھی
آنکھیں ملتی ہوئی آ گئی۔ کا ماٹن نے بھی کمرے کا رخ کیا، بجتا ور کمرے میں داخل
ہوئی ہی تھی کہ ہم اُٹھ بیٹھے مگر پاؤں ابھی پردے میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ہمیں
اس حالت میں دیکھ کر اس لونڈیا کو بھی بے اختیار ہنسی آ گئی اور وہ لگی کھل کھلا کر

ہمنے اس آواز پر بیگم صاحبہ نے ایک ہاتھ آنکھ پر سے ہٹا کر جو ملاحظہ فرمایا تو ہم گھٹنوں کے بل کھڑے ہوئے اور بختاور ہنستی ہوئی نظر آئی بس اب کیا تھا غریب بختاور کی شامت ہی تو آگئی فونٹن پن سوان انک کی شیشی میز پر سے اٹھا کر بختاور پر کھینچ ماری مگر اتفاق سے وہ تو بچ گئی لیکن شیشی دیوار پر لگ کر ٹوٹ گئی اور روشنائی دیوار سے اچھل کر ہمارے منہ سر اور چھاتے پر افشاں کی صورت میں آرہی۔ بال بھی سرخ ہوگئے اور گال پیشانی آنکھ، ناک بھی لال لال ہوگئے تھوڑی دیر پہلے تک مارے ڈر کے ہمارا برا حال تھا مگر اب ہمیں بھی غصہ آگیا اور ہمنے بھی یہی سمجھا کہ کچھ ہو آج بیگم صاحبہ کو کم از کم دو تمانچے رسید کر دینے چاہئیں ہم اس مارنے کے ارادے یا مارنے کے خیال یا مارنیکی غرض سے یا مارنے یا مارے جیسا کرنے یا مارنے کی نیت سے ابھی قدم بھی اٹھانے نہیں پائے تھے کہ انا نے کمرے میں قدم رکھا اور ہمیں سر سے پاؤں تک سرخ سرخ دیکھ کر اسے خون کا شبہہ ہوگیا اور وہ لگی چیخنے "ہائے دولھے پاشا وائے دولھے پاشا اللہ اللہ منہ سب خون میں بھر گیا منہ سب خونا خون ہوگیا۔ اس منظر کو کاماٹن نے دیکھا تو اسے کچھ اور تو سوجھا نہیں لگی وہ ڈاڑھیں مار مار کر رونے اس تعزیہ داری کی شرکت کیلئے گھر بھر کی حاضری ضروری تھی ہماری دونوں سالیاں اپنے اپنے کمروں سے دوڑتی ہوئی آئیں ممانی جو شدہ اماں بھی ہانپتی ہوئی آپہونچیں، اور پھر ماموں جان بھی پریشاں از لنگ (تہمد)

باندھے کنٹوپ اوڑھے ٹھوڑی کے نیچے ہیٹ کی تسمے کی طرح کنٹوپ کے بند باندھے ہوئے سرہانے سے پیش قبض اٹھا کر آ پہونچے، ماما ئیں بھی جاگ پڑھیں۔ ہمارے کمرے میں پہونچکر بڑے میاں نے انتہائی سراسیمگی سے پوچھا کیا ہوا بیٹا؟ ہم اس میں شک نہیں بوکھلائے ہوئے ضرور تھے مگر واقعہ بیان کرنے کے سوا چارہ کیا تھا ہم نے کہا جی کچھ نہیں سُرخ روشنائی گر گئی بڑے میاں نے آگے بڑھکر غور سے چہرے کو دیکھا اور نہایت ہی متانت سے پوچھا وہ کس طرح اب ہمنے بکمال مظلومیت سارا قصہ سنایا کہ ہم پچھلے دروازے سے اس طرح آرہے تھے اور یوں پاؤں پھسلا اور ہم پردے میں لپٹ کر اس طرح گرے اور بیگم صاحبہ نے چونک کر ایسی چیخ ماری اور بجتا وریوں دوڑتی ہوئی آئی اور اس طرح ہم اٹھ رہے تھے کہ وہ ہنسنے لگی اس پر خفا ہو کر بیگم نے یوں سیاہی کی شیشی پھینکی اور وہ شیشی دیوار پر یہاں لگ کر ٹوٹی اور اسکی سیاہی یا سرخی یا روشنائی اس طرح ہماری سرخروئی کا باعث ہوئی اور انا نے خواہ مخواہ رونا شروع کیا" بڑے میاں تو خیر سارا قصہ خاموشی سے سنکر مسکراتے ہوئے پلٹ گئے مگر دونوں لڑکیوں (سالیوں) نے ہنسنا شروع کیا اور بڑی بی نے دونوں ہاتھوں سے چٹ چٹ بلائیں لیکر سیکڑوں دعائیں دیں اور لگیں تحقیقات کرنے کہ کس نے موز کا چھلکا سیڑھیوں پر پھینکا وہ تو ہم نے ہوشیاری کی جو بڑی بی کو باتوں میں لگا کر

دالان تک پہونچا دیا ورنہ صبح تک بھی موز کے چھلکے کی تحقیقات ختم نہ ہوتی ہمارے واپس آتے ہی دونوں سالیوں نے انگلیاں مٹکا مٹکا کر گانا شروع کیا ع ہم بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گئے۔

ہمنے ان شیطانیوں سے پیچھا چھڑانا ہی مناسب جانا اور آہستہ سے غسل خانے کی راہ لی، وہاں پہنچکر شیروانی اتاری، صابون لگا لگا کر سر اور منہ دھونا شروع کیا۔ سر تو صاف ہو گیا مگر سرخروئی نہ گئی، لال لال دھبّے گالوں اور پیشانی پر باقی رہ گئے۔ صابون سے بیسن سے گھسنی سے ہر چیز سے رگڑ رگڑ کر ان دھبوں کو نکالنے کی کوشش کی لیکن ؎

سرخی کے نشان گئے نہ رُخ سے
ناحق دو گھنٹے شست و شو کی

آخر تھک کر ہم نے یہ شست و شو ختم کی اور کمرے میں آکر دیکھا تو بیگم صاحبہ بڑے ٹھسّے سے تیوری چڑھائے پیشانی پر ہزاروں شکن ڈالے ایک ہاتھ کمر پر اور دوسرا میز پر رکھے ہوئے ہمیں گھور رہی تھیں مارے غصّے کے کندنی رنگ اور چمک اٹھا تھا۔ سانس زور زور سے لے رہی تھیں سینے کا تموّج بھی بڑھ گیا تھا۔ اس بد "وچیز" کو دیکھ کر ہم ساری کلفت بھول گئے بے تحاشا آگے بڑھکر ... ہائیں ہائیں ... بس غضب ہی ہو گیا وہ تو صبح سے بھری بیٹھی تھیں برس پڑیں اور لگیں لتھاڑنے گویا پہنیا موزی کی اصطلاح میں

مذاکرۂ علمیہ برپا ہو گیا۔

"بس دور ہی رہو صبح ساڑھے سات بجے سے گئے ہوئے آئے ہیں رات کے دو بجے غضب خدا کا اکیس گھنٹے مزے میں گزار دیئے اور خبر نہ ہوئی بیوفائی کی انتہا بھی ہے ہمنے آپکے کارن آپا بسرا دیا مگر آپ ہیں کہ دوستوں میں گرفتار نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے رہے کہ صبح کے گئے اب آرہے ہیں اور آئے بھی تو اس مردار بجناور کے پاس نہ جانے کب سے پڑے ہوئے تھے جب جی بھر گیا تو اُسے لیکر میرے پاس وارد ہوتے ہیں۔ اللہ اللہ اس نکٹی کلموہی سے نہ جانے کیا محبت ہو گئی ہے کہ دن رات اسی کا کلمہ پڑھا جاتا ہے صبح سے شام تک بس بجناور کا وظیفہ ہے کام کہیں گے تو بجناور کو ہنسیں گے تو اسی کے ساتھ گھل مل کر باتیں ہونگی تو اسی سے انعام دیں گے تو اسی کو تعریف ہوگی تو اسی کی تائید کرینگے تو اسی کی میں کہتی ہوں کہ آخر اس سے ایسی ہی محبّت ہے تو نکاح کیوں نہیں کر لیتے اسی کو ساتھ لیکر خوشی خوشی زندگی بسر کرو اور خوش رہو میں منع تھوڑا ہی کرتی ہوں تم باندیوں ہی سے خوش ہو تو انہیں کے ساتھ رہو کہنے والا کون ہے، پرسوں خالہ امّاں کے ہاں نیاز میں جاتی ہوئی میں اس مردار کو بھی ساتھ لئے جا رہی تھی۔ امّا جان نے ناحق روکا اب جو واپس آکر دیکھتی ہوں تو اور ہی عالم ہے کلموہی نکٹی مردار پٹیاں سنوارے اچھلتی کودتی پھر رہی ہے اس کے انداز دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ کچھ نہ کچھ

بھید ہے اب جو کمرے میں آکر دیکھتی ہوں تو پلنگ پوش پر سلوٹیں پڑی ہوئی
ہیں سرہانے کے تکئیے میں اس مُردار کے سر کے ناریل کے تیل کی بو بسی ہوئی
ہے۔ کمرے کی چاندنی پر اس کے پاؤں کے بیسوں چھاپے پڑے ہوئے ہیں
میں گئی تھی بارہ بجے اور آپ صبح کچہری جا چکے تھے آکر دیکھتی ہوں تو تھی نہیں
میرا یہ خیال ہوا کہ ابھی کچہری سے آئے نہ ہونگے وہی مُردار آکر لوٹی ہوگی مگر
رستم سے پوچھتی ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ حضور دو بجے تشریف بھی لائے تھے۔
پانچ بجے تک کمرہ بند کئے .... رہے میرے آنے سے پہلے باہر
تشریف لیگئے اور پھر سب کو منع بھی کر دیا کہ دیکھو گھر آنے کی اطلاع بیگم صاحبہ
کو نہ دینا، رات کے نو بجے آتے ہیں تو ایسے غریب جیسے کچھ جانتے ہی نہیں
نہ تو اپنے آنے کا تذکرہ کرتے ہیں اور نہ میرے جانے کی وجہ پوچھتے ہیں اور میں
جو نیاز میں جانے کا قصہ سناتی ہوں تو حضور کو تعجب بھی ہوتا ہے۔ اچھا تم
ہو آئیں، کہکر اظہار تعجب بھی کرتے ہیں، اُف رے تیری عیاری خدا نے مرد بنایا
سو یہ حال ہے۔ اگر عورت ہوتے تو نہ معلوم "کلیوپٹرا" کا نام زندہ کرتے کہ "سلومی"
کے جانشین ہوتے پیر زن، فرہاد کش، بنتے کہ عورت ڈلا کہلاتے،،

گذشتہ جمعرات کو دن بھر غائب رہے رات بھر غائب رہے جمعہ کے
روز تشریف لاتے ہیں تو اس ہیئت کذائی سے کہ شیروانی میلی قمیص اور پاجامے
پر رنگ برنگ کے دھبے چہرا اترا ہوا، آنکھیں سُرخ سُرخ خمار آلود، ہونٹوں پر

بیڑیاں جمی ہوئیں چلتے ہیں تو عجیب انداز سے ایک طرف قدم رکھتے ہیں تو ایک طرف پڑتا ہے کہنا کچھ چاہتے ہیں منہ سے نکلتا کچھ ہے آتے ہی غسل کیا اور پھر پڑ کر سو رہے تو چار بجے تک۔ جب کہیں آدمی نے پوچھا تو وہی کہا کہ دوستوں نے مجبور کر کے اپنے ساتھ حمایت ساگر کھینچ لیا تھا رات بھر جاگتے رہے نیند کا خمار تھا۔ اسی لئے آ کر سو رہا، مجھے اس پر بھی شبہ نہیں ہوا، دستی سونگھتی ہوں تو آمیں مصالحہ کی بو بسی ہوئی، بیچارے اُن کے دوست مصالحہ شیروانی میں ملتے ہوں گے۔ یا ڈاڑھی مصالحہ سے دھوتے ہونگے پوچھا تو کہا کہ عبدالحق کا بچہ منظور انّا کی گود میں بیٹھا میری دستی سے دیر تک کھیلتا رہا اسی انّا کے سر کے مصالحہ کی بو ہو گی بھلا غور کرنے کی بات ہے کہیں انائیں مامائیں بھی سر میں مصالحہ اور عمر خیام آئل ڈالتی ہیں۔ جو دستی میں بُو بسے، اسپر بھی میں خاموش ہو رہی مگر پرسوں معلوم ہوا کہ حضرت نے اپنے "دزدانِ عرب" یعنے دوستوں کے ساتھ جلسہ منایا ہے خدا ان دوستوں سے سمجھے وہ بیچارے مولوی[۱] صاحب کتنی مقدس صورت کے بزرگ ہیں۔ ڈاڑھی دار آدمی ٹخنوں سے اُوپر پاجامہ شرعی مونچھیں شریفانہ، صورت بالکل مولویانہ مگر کُن چال ایسے کہ بس کہے نہ جا سکیں، سنا کہ بیچارے صبح چھ بجے گھر سے نکل کر رات کے بارہ بجے پہونچتے ہیں اور بیچ میں بھٹک کر نہیں دیکھتے بیچاری بیوی گھر میں پڑی کڑھا کرتی ہے

[۱] مولوی عبدالوہاب عقل مند

دھوپ ہو، بارش ہو جاڑا ہو کچھ ہو مگر مولوی صاحب کے اس معمول میں فرق نہیں آتا، یہ بھی کوئی زندگی ہے وہ عبدالحق صاحب اتنی بڑی فرم کے مہتمم ہیں سنتی ہوں کہ بڑے منتظم اور بیوپاری دماغ کے آدمی ہیں اور پھر بیوی سے بھی ڈرتے ہیں مگر ان لوگوں کا ساتھ دینے سے باز نہیں آتے اسی محبت نے ان کی مٹی بھی پلید کی عبدالرحمٰن تو آپ کے بچپن کے ساتھی ہیں مگر اب کچھ ان کا ساتھ چھوٹ رہا ہے۔ بیچارے نہایت کم سخن منکسر مزاج غریب طبیعت کے آدمی ہیں گھر سے نکلے دفتر گئے اور دفتر سے نکلکر سینما پہونچے پھر گھر جا کر پڑ رہے۔ مگر کبھی کبھار بڑی سرگرمی سی انکی پارٹیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ شاہ صاحب بیچارے اللہ والے آدمی ہیں مگر ان کو بھی رنگ پر لانے کی کوششیں ہو رہی ہیں میرزا صاحب ہیں کہ بھٹک رہے ہیں۔ غضب خدا کا بیچاروں کے پاس بارہ بارہ ایک ایک بجے رات تک بیٹھتے ہیں وہ بیچارے بھی مارے مروت کے کچھ نہیں کہتے، اگر یہی لیل و نہار رہے تو شاہ صاحب کا یہ تقدس بھی کوئی دن کا مہمان ہے وہ بھی ایک نہ ایک دن رنگ پر آہی جائیں گے، میں پوچھتی ہوں کہ آخر آپ لوگوں کو ہو کیا گیا سب کے سب شریف پڑھے لکھے تعلیم یافتہ اور یہ حرکات، آپ ہیں کہ بلا کسی خوف کے جلسے اڑا رہے ہیں کل ہی کی بات ہے رمضان کی ۲۶ تاریخ کی رات کو جلسہ کیا اللہ اللہ کیسے دن اور آپ لوگ ہیں کہ جلسے مناتے ہیں گانے سنتے ہیں مجھ سے کہا کہ غیاث کے لڑکے کی بسم اللہ ہے دعوت میں جائیں گے صبح

نہایت غربت سے آکر سو رہے کہنے لگے رات ذرا جاگا تھا تھوڑی دیر قوالی ہوئی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ قوالی نہیں اس شور اپروالی کا گانا تھا۔ گن چال ایسے اور پھر دیکھئے تو "مولانا" وہ مضمون لکھیں گے کہ واہ جیسے کوئی بڑا ہی مقدس سید سلیمان یا عبدالباری فرنگی محلی بیٹھا لکھ رہا ہو دوسرے کی خانگی زندگی پر اعتراض کرینگے اوروں کے عیب گنتے پھرینگے مگر اپنے گریبان میں سر ڈال کر نہیں دیکھینگے ؂

کسی نے اونٹ سے پوچھا تیری گردن کیوں خم ہے

تو بولا کونسا عضو میرا شمشاد سے کم ہے

خدا کی مار اس گندم نما جو فروشی پر،

ظاہر میں آدمی تو بڑے شاندار ہیں

اسوقت بیگم صاحبہ کا پارہ اکیسو پندرہ سے بھی کچھ اونچا ہو چلا تھا۔ ہمیں خوف یہ تھا کہ کہیں حملہ آور نہ ہوں مگر خیر یہ گذری کہ ابھی وہ رجسٹر خوانی کر رہی تھیں کہ اذان کی آواز آنے لگی "الصلوٰۃ خیر من النوم" کو ہم نے دہرانے کے بجائے "الصلوٰۃ خیر من الغضب" کو تین تین چار چار دفعہ دہرانا شروع کیا اور دوڑ کر پھر غسل خانہ پہونچ گئے وضو کیا اور کمرے میں آکر جانماز بچھائی اور نماز شروع کر دی مگر بیگم صاحبہ اسی انداز سے بیٹھی رہیں ہمنے نماز کے بعد دعا مانگنی شروع کی کہ خداوندا! بیوی کے غصے سے بچا، پروردگارا! گھر داماد ی کی لعنت سے نجات دیجیو، مالکا! ان ازدواجی زنجیروں سے چھڑائیو، خدایا

موت دیکھو کہ مرکر پیچھا چھوٹے۔ یا گیارہ ہزار روپیہ دیکھو کہ مہر ادا کرکے اس بلا سے
نجات پاؤں ابھی ہم نے دعا ختم بھی نہیں کی تھی کہ اثرِ اجابت ظاہر ہونے لگا بیگم صاحبہ
کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور کہنے لگیں اجی مہر کیوں ادا کرتے ہو لو میں معاف کئے
دیتی ہوں کہو تو لکھدوں کہ میں نے مہر بخشا چلو اب تو خوش ہوئے نجات ملگئی
مہر بچا اب رہی تمہاری بنجاور سو میں نے اسے بھی آزاد کیا خوشی سے لیلو چلو
چھٹی ہوئی۔ دوستوں کے ساتھ مزے سے رہو اب جو ہمنے انہیں دیکھا تو اور ہی
عالم تھا لیمپ کی روشنی پھیکی پڑ چکی تھی صبح کی سفیدی میں [illegible] ساڑھی عجب [illegible]
بہار دے رہی تھی انکا مسکرا مسکرا کر باتیں کرنا غضب ڈھا رہا تھا ہم نے جانماز سے
اٹھکر بے تحاشا۔ لیا .... اور پھر نہایت ہی پھرتی سے انہیں کرسی پر سے
اٹھا لیا کمرے میں پہونچکر چارپائی پر لیٹے ہی تھے کہ بیگم صاحبہ نے پھر شکوے
شکایتوں کا دفتر کھولنا شروع کیا۔ مگر دن بھر کی گردش رات بھر کی بیداری اور
کوفت نے اس قدر تھکا دیا تھا کہ بادِ سحر کے دو ہی جھونکوں میں ہم فنا فی النوم ہوگئے۔
شاید ہمیں سوتا پاکر وہ بھی سو گئیں دوسرے روز ہم بیدار ہوتے ہیں تو دن کے
ڈیڑھ بجے ہائے کتنے مزے کی نیند تھی ہمنے اٹھکر انہیں بھی جگا دیا دونوں نے
اٹھکر ضروریات سے فراغت حاصل کی ناشتہ کیا وہ جاکر اپنی بہنوں کے پاس
بیٹھ رہیں اور ہم لگے انکشاف کیلئے مضمون لکھنے ہائے سہ

زندگی جبر رد سے ڈر ڈر کے گزارنے تو پھر ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

مضمون کیسے لکھیں

"لکھنا، یا لکھنے کا ارادہ کرنا، یا لکھنے کے خیال سے قلم اٹھانا، یا کاغذ کھینچنا یا کوئی حرکتِ اضطراری یا غیر اضطراری ایسی کرنا جس سے "لکھنا" ظاہر ہو، جرم ہے۔ ادھر ہم نے لکھنے کے خیال سے کرسی سیدھی کی اور ادھر بیگم صاحبہ نے سروتا اور چھالیا، یا کروشیا کی سوئیاں یا سوزن کاری کا چوکھٹا۔ یا لال برادرز، کا ناول یا اخبار صحیفہ جو کچھ ہاتھ میں تھا زور سے پٹک دیا اور گھورنے لگیں، ہم نے انگڑائی لیکر سگرٹ جلایا اور فلس کیپ کا تختہ کھینچا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں، ادھر ہم نے فونٹین پن اٹھایا اور ادھر وہ آگے بڑھنے لگیں ابھی ہم نے کاغذ پر ایک نقطہ بھی نہیں دیا تھا کہ انہوں نے "خطبۂ افتتاحیہ" یا "استقبالیہ" شروع فرما دیا، جس میں ہمارے دوست احباب رسائل اور اخبارات اس کے مدیر اور ناشر مرحوم والدین اور خسر صاحب قبلہ اور "ننھے" میاں طولعمرہٗ سب کے نام لیے بعد دیگرے نہایت ہی سنجیدگی سے گنائے گئے اور وہ صلواتیں سنائی گئیں کہ ہم نے آنکھیں

بند کرلیں، قلم میز پر رکھ دیا، سگرٹ کو تھالی میں پھینکا اور پھر کرسی پر دراز ہو کر "شادی اور اس کے مضر اثرات" پر ایک پُر مغز مقالہ ذہن میں ترتیب دینے لگے،

رات مولوی عبدالوہاب نے مرغ کی دعوت دی تھی۔ کھانیکے معاملہ میں ہم بڑے فیاض واقع ہوئے ہیں، تیار ہو گئے مگر بیگم صاحبہ سے اجازت لینی بھول گئے۔ پانچ بجے مکتبہ پہونچے تو یاد آیا مگر کرتے کیا؟ مجبوری تھی کھانا کھا کر آٹھ بجے رسی ڈونسی پہونچے قلعہ دار کو ایک تصویر انلارج کرنے دی تھی خیال تھا کہ تصویر لیتے ہوئے گھر جائیں گے مگر دوکان بند تھی، مجبوراً آگے بڑھنا پڑا نانڈو کے کچھ پیلیس پر پہنچے تو نئی نئی تصویریں نظر آئیں اور ہم نے تعجب، حیرت، استعجاب سے دیکھنا شروع کیا اور رنگین پوسٹ کارڈ دیکھتے دیکھتے "کشمیر کی خوبصورتی" پر نظر پڑی تو طبیعت نکل گئی اسلئے نہیں کہ "حسنِ کشمیر" نے لبھالیا بلکہ چند "گذری ہوئی راتیں یاد آگئیں، ہائے عقل پر نہ جانے کیا پردے پڑ گئے تھے کہ ہم نے کچھ سونچا نہ سونچنے کی کوشش کی اور نہ اسوقت سونچ ہی سکتے تھے، سائکل سنبھالی اور کہیں سے کہیں پہنچ گئے مدتوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی کچھ "شکوے شکایتیں" ہوئیں، کچھ "رونا دھونا" ہوا، کچھ "باتیں واتیں" ہوئیں اب جو ہم گھڑی دیکھتے ہیں ساڑھے بارہ! اُف ہم تو سٹی بھول گئے مگر وہ بیچاری سمجھ دار تھیں کہنے لگیں "ہاں صاحب! بیگم صاحبہ انتظار کر رہی ہونگی جائیے جلد جائیے ایسی جلدی تھی تو آنا کیا ضرور تھا، برسوں کے بعد آئے بھی تو منٹوں کیلئے دیکھئے! کہیں

بیگم خفا نہ ہو جائیں۔ خدا حافظ تشریف لے جائیے" ہم لاکھ "زن مرید" سہی مگر ایک صنفِ نازک کے ایسے جلے کٹے فقرے کس طرح سنتے، جھٹ شیروانی اتار دی شوز اور پاتابے بھی نکال دیئے جیب سے دستی نکال کر گلے میں باندھ لی عینک بھی اُتار کر رکھدی اور سگرٹ کیس لیکر دھم سے چارپائی پر آرہے، اس مجنونانہ حرکت سے اس نیک بخت کو خوشی ہوئی یا رنج پہنچا اسکا علم خداوند عالم ہی کو ہو تو ہو مگر ہم تو اپنی دانست میں زن مریدی کی تہمت سے بری ہوگئے رات گذری اور بے غل و غش گذری بقول حضرتِ جوشؔ۔

صد عمر گراں مایہ سے بہتر ہے وہ رات
جو پہلوئے جاناں میں بسر ہوتی ہے

صبح ساڑھے چھ بجے چلے اور سوچتے چلے کہ کیا کریں آخر ایک ترکیب سوجھی ہم خوش خوش گھر پہنچے، پھاٹک پر رستم علی کو ڈانٹ بتائی دیوان خانہ میں لاؤ کو گالیاں دیں، سائیکل کو زور سے پٹک دیا اور زنانے میں داخل ہوئے بختاور راستہ کترا کر جانے لگی تو اُسے بھی جھاڑ دیا اپنے کمرے میں پہنچکر دھماکے کیساتھ دروازہ کھولا دریچوں کو بھی زور سے کھینچ دیا۔ ٹوپی آرام کرسی پر پھینکی اور شیروانی تو ال اسٹانڈ پر ڈالدی، کالر کتابوں کی الماری پر پھینکا، پاتابے ردی کی ٹوکری میں ڈالے عینک گھڑیال کے اوپر رکھی، ڈرا کو زور سے کھولکر سگرٹ کا ڈبہ نکالا، اور منہ ہی منہ میں چند بے معنی الفاظ کہتے ہوئے غسل خانہ کا رخ کیا۔ وہاں بھی خوب شور مچایا،

ہماری مسکینیت ضرب المثل تھی، ہم گریہ مسکین مشہور تھے گھر بھر کو معلوم تھا کہ ہمیں غصہ آتا ہی نہیں اور اگر کبھی آبھی جائے تو بیگم صاحبہ کی معمولی سی ڈانٹ ہیں سب فو ہو چکر، مگر آج ہمیں غصہ میں بھرا ہوا دیکھکر گھر کا گھر سناٹے میں آگیا ایک دوسرے کا منہ تکنے لگا ماموں صاحب چبوترے تک آکر دیوان خانے میں چلے گئے ہم نے انہیں سلام بھی نہیں کیا، ممانی صاحبہ کمرے کے سامنے اپنی منجھلی صاحبزادی کے کمرے میں آکر بیٹھ گئیں اور لگیں چلمن سے جھانک جھانک کر دیکھنے، ہماری منجھلی اور چھوٹی سالیاں بیگم صاحبہ کے پاس پہنچ گئیں اور کانا پھوسی ہونے لگی، ہم نے کہا چلو ابتدا تو اچھی ہوئی خدا کرے انتہا بھی اچھی ہو،

ساڑھے سات بج گئے مگر ناشتے کا پتہ ندارد ہم نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر نام بنام، بختاور، گلنار، لیلیٰ، ہارسنگار، انا جی آیا، سب ہی کو ڈانٹ بتائی، آج تک ہم نے سوائے بختاور کے کسی کو کچھ نہیں کہا تھا یہ جو سب کے نام لیکر ہم نے اسپیچ دی تو بس سب کے سب دوڑ پڑے، کسی نے دسترخوان بچھا دیا کسی نے رکابیاں جما دی، کوئی کھانے کے برتن لائے گئی، کوئی دوڑ کر سیلابچی اور آفتابہ لے آئی، انا جی ہانپتے ہوئے آکر کھچڑی کا ڈش رکھ گئیں، گلنار نے پاپڑ کی رکابی رکھی، اور لیلیٰ نے اچار دان جما دیا، ہارسنگار مکھن لے آئی، آیا قیمہ کا کٹورہ لیکر دوڑی، ہم نے ناشتہ شروع کیا "ننھے میاں" کچھ رینگتے ہوئے آگئے۔ ہم نے بکمال شفقت پدری انہیں بازو بٹھالیا، اور ایک رکابی میں پاپڑ ڈال کر

سامنے رکھدیا وہ "آبا امّاں روئی" کھاتا ہوا پاپڑ کھانے لگا۔ ہم نے ناشتہ ختم کیا، چائے کی دو پیالیاں پیں اور باہر نکلنے کے قصد سے پاتابے اور شوز پہنے مگر صحن کو دیکھتے ہیں تو بھیگا ہوا، یوں تو کل چار بجے ہی سے بارش ہو رہی تھی اور صبح ہی سے تقاطر ہو رہا مگر اب تو اچھی خاصی پھوار تھی، ہم نے کہا جانے بھی دو، دوپہر کا کھانا کھا کر اطمینان سے چلینگے، بختاور نے کمرہ جھاڑ کر ٹھیک کر دیا تھا، ہم میز کے آگے گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور لگے نیرنگ کیلئے مضمون لکھنے! حضرت عزیز نے مضمون کی فرمایش کی بھیجا تو لکھا کہ ایسا نہیں ایسا چاہئے، اب کہئے کیسا لکھیں؟ ہم نے بہتیرا سوچا مگر کوئی عنوان سمجھ میں نہیں آیا،

"وہ لائٹ ہیومر" چاہتے ہیں اور یہاں یہ حال کہ "دل ہی بجھ گیا" خوش مذاقی سوجھے تو کیسے اس کے لئے ضرورت ہے اطمینان، فارغ البالی، آسایش کی، خدا سلامت رکھے وہ بھیّا رموزی ہی ہیں کہ چاہے دو وقت کھانا نہ ملے مگر آپ "ظریفانہ" مضمون لکھے جاتے ہیں، ہم سے یہ نہیں ہوتا، خیر ہم نے کہا لاؤ کل کی دعوت کی تفصیل ہی لکھ دیں مگر اس میں کیا تھا بدمزہ سالن اور عبدالحق صاحب کے روکھے قہقہے! پھر خیال ہوا کہ گذشتہ رات ہی کے کچھ حالات لکھدیں مگر وہ بھی اس قابل نہ تھے، چند شکوے شکایتیں، کچھ جلے کٹے فقرے، آئندہ کیلئے وعدے اور قسمیں صبح کی دہشت انگیز واپسی! آخر سوجھی تو یہ کہ تفصیل ہی لکھدیں، ہم نے دعوت کے بعد سے ترتیب وار واقعات کو قلمبند کرنا شروع کیا اور فلسکیپ کے

ڈیڑھ صفحے تک بھی نہ پہنچے تھے کہ کچھ "چلت پھرت" کے آثار معلوم ہونے لگے کمرے کے دروازہ کے پاس بڑی بیگم صاحبہ (ممانی اور خوشدامن) دیوار کی اوٹ میں کھڑی ہوئی نظر آئیں، دونوں دریچوں کے پاس دونوں سالیاں چھپی ہوئی دیکھنے لگیں سامنے مدن مست کے درخت کی اوٹ میں گلنار اور لیلی کھڑی تھیں، غسل خانہ کے پردے کے پاس آیا، اناجی اور بختاور کے سائے نظر آنے لگے ہم اس "نسوانی دھاوے" کا مطلب سمجھنے بھی نہیں پائے تھے کہ دبے پاؤں بیگم صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں، شہابی رنگت رونے سے سرخ ہوگئی تھی، آنکھیں ابل آئی تھیں، گال تمتمائے ہوئے تھے، چہرہ پرنا شتہ نہ کرنے اور کسی قدر شب بیداری اور کرب واضطرار کی وجہ سے اداسی برس رہی تھی، نہ تو لباس ہی بدلا گیا اور نہ منہ دھویا گیا تھا مگر باوجود اس کے ایک "خاص ادا" تھی جو مارے ڈالتی تھی، کچھ غصہ، کچھ خوف، کچھ نفرت، کچھ رحم، کے مختلف اثرات چہرے سے نمایاں تھے مگر پیشانی پر ہزاروں شکنیں، تیوری چڑھی ہوئی، ناک کے نتھنے پھولے ہوئے، ہونٹ آپس میں ملے ہوئے تھے، ہم نے "جل تو جلال تو" کا ورد شروع کیا اور لگے برا شتہ قلم لکھنے "وہ" آکر پیچھے کھڑی ہوگئیں ہم نے کاغذ پر بلاٹنگ پیپر رکھدیا اور قلم کو ہونٹوں میں پکڑ کر غصہ سے دیکھنا شروع کیا، اف! برس پڑیں اور بری طرح برسیں!

"کہئے رات کہاں رہے؟ نہ جانے کس بیسوا کے یہاں رات گذاری، صبح آئے بھی تو اس شان سے کہ سارا گھر سر پر اٹھا لیا، اب حکومت شروع ہوگئی وہ

بھیگی بلی جو کل تک چوہوں سے ناک کتراتی تھی آج حملہ کرنے دوڑتی ہے خدا کی شان، مجھے کو رات بھر بخار رہا، کھانسی کی وہ شدت تھی کہ غریب ساری رات نہیں سویا، مگر تمہیں کیا، تم کسی جگہ مزے اڑا رہے ہونگے، مہینہ میں دس بارہ راتیں ہی ایسی منحوس آتی ہونگی جو تم مکان پر سوتے ہو، ورنہ کبھی عبدالحق کے پاس دعوت ہوتی ہے تو کبھی عبدالوہاب کے پاس مہمانداری، کبھی عبدالرحمن سینما لیجاتے ہیں تو کبھی خانصاحب روک لیتے ہیں، کبھی رشید کو لمبو سے آتے ہیں تو کبھی رشید یادگیر کو جاتے ہیں، کبھی حمایت ساگر میں جلسہ ہوتا ہے تو کبھی گنڈی پیٹھ میں پارٹی ہوتی ہے، کبھی شمس آباد جاتے ہیں تو کبھی بھونگیر ہو آتے ہیں، یہ سب حیلے بہانے صرف رات بھر غائب ہونے کیلئے ہوتے ہیں، اور بس، ایسا ہی ہو تو صاف صاف کیوں نہیں کہدیتے کہ ہم آج رات گھر پر نہ سوئینگے، چلو چھٹی ہوئی، یہ جھوٹے واقعات بیان کرنے جھوٹ کہکر ایمان خراب کرنے سے فائدہ کیا؟

صبح ناشتہ کرکے غائب ہوئے تو ڈیڑھ دو بجے تک ندارد اور پھر آئے تو سوائے کھانا کھانے اور کپڑے بدل کر بھاگنے کے اور کوئی کام نہیں، کبھی سبحان صاحب سے ملنا رہتا ہے تو کبھی مجید سے، کبھی قلعدار کے پاس کام رہتا ہے تو کبھی تصدق حسین سے، کبھی مکتبہ جانا ہوتا ہے تو کبھی کتب خانہ ڈھائی تین بجے گئے تو پھر واپسی کی امید نہیں، وہ رات بڑی ہی خوش نصیب ہوتی ہے جو آپ کو آٹھ بجے گھر پہنچادے ورنہ آپ تو دس گیارہ بجے آئینگے یا صبح کو، رات آئے بھی تو

کپڑے اتارے اور لگے ڈاک دیکھنے، پھر جو خطوط اور مضامین لکھنے بیٹھ گئے تو دو دو بجے رات تک اور بعض وقت تو صبح تک اس مضمون نگاری کو خدا غارت کرے کہ اُس نے تم کو دین کا رکھا اور نہ دنیا کا، تمام وقت مضمون نگاری کی نذر سب کام اُس کے پیچھے خراب جورو کی فکر نہ بچوں کا خیال، پانچ وقت کی نماز تو ہی دور آپ سے جمعہ بھی نہیں پڑھا جاتا، ساری دنیا جمعہ کی نماز کو جاتی ہے اور آپ بیٹھے مضمون لکھا کرتے ہیں۔ عیدیں گذر جاتی ہیں اتنا احسان تو کرتے ہیں کہ عید کی صبح اٹھکر نہا دھو لیا، اور پھر بیٹھ گئے لکھنے! جب سب لوگ نماز پڑھ کر عیدگاہ سے آگئے تو آپ لوگوں سے ملنے چلے، رمضان میں ایک بھی روزہ رکھا ہو تو روزی نہ ملے، شعبان میں قبرستان پر فاتحہ پڑھی ہو تو دشمنوں کو وہی زمین نصیب ہو، شبرات قدر، معراج میں نماز پڑھی ہو تو گنہگار، کبھی کسی چیز پر ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ دیدی ہو تو دشمنوں کے ہاتھ ٹوٹیں، کبھی کسی کے وعظ میں گئے ہوں تو قسم لیجیے اور پھر آپ کے مذہبی جوش کا یہ حال کہ امان اللہ خاں کو افغانیوں نے تخت سے اتار دیا تو ایکدن کھانا نہیں کھایا، ہائے افغانستان اُجڑ گیا، ایک اسلامی سلطنت برباد ہو رہی ہے ایک اسلامی ملک متمدن بنتی بنتی جہالت کے گڑھے میں گر رہا ہے، کہکر ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتے رہے، نادر خاں کی تخت نشینی کی اطلاع سے اتنے خوش ہوئے کہ میں نے جلوے کی رات بھی اتنی خوشی محسوس نہیں کی تھی افغانستان بھاڑ میں جائے اور کابل کے تخت کو آگ لگے تم کون؟ تمہیں کیا کام؟ تمکو اس سے

غرض کیا؟

بچہ بیمار ہے تو تمہیں فکر نہیں، بیں مرا کروں تو تمہیں پرواہ نہیں، گھر میں چاہے کچھ ہو جائے تمہیں احساس نہیں، تمہیں فکر رہتی ہے تو افغانستان کی، ترکی کی، ایران کی البانیہ کی، امان اللہ خاں، ثریا خانم، مصطفےٰ کمال، عصمت پاشا، رضا شاہ، احمد زوغو کی، آخر یہ لوگ تمہارے ہیں کون؟ خیر یہی غنیمت ہے کہ ممالک اسلامیہ اور اسکے فرمارواؤں سے تمہیں ہمدردی تو ہے مگر یہ مضمون نگاری آخر کیوں؟ معارف، نگار، ہمایون، نیرنگ خیال، مرقع، نیرنگ، تجلی، شاعر، فردوس، اولڈ بائے، ان رسالوں سے تمہیں کیا کام تم ندوۃ العلماء کے طالب علم نہیں، کسی مسجد کے مولوی یا خانقاہ کے پیرزادے نہیں پھر معارف سے دلچسپی کیوں، کوئی دہریئے لامذہب، پانچ کی بجائے دو نمازوں کے قائل نہیں، نیاز فتحپوری کے متبع نہیں پھر نگار سے ہمدردی کس لئے؟ لاہور سے کوئی تعلق نہیں، پنجاب میں پرورش نہیں پائی پھر ہمایون، نیرنگ خیال، فردوس کا کلمہ پڑھتا کیا ضرور، لکھنؤ کی شاعری سے تمہیں نفرت، لکھنوی طرز معاشرت سے چڑھ، پھر مرقع سے لگاؤ کس لئے؟ رامپور تم نے دیکھا نہیں، پھر وہاں کے نیرنگ میں مضمون نگاری کیا معنی؟ امروہہ سے تمہیں کونسا تعلق نام ہی نام تو سنا ہے پھر وہاں کے رسالۂ شاعر کی فکر کس واسطے؟ حیدر آباد سے سینکڑوں رسالے نکل رہے ہیں بیسیوں اخبار جاری ہیں مگر تمہیں تجلی سے خصوصیت کیوں؟ سردار علی صاحب تمہارے اُستاد ہوں تو یہ کیا ضرور ہے کہ

سب رسالوں کو چھوڑ چھاڑ کر تم تجلی ہی کے ہو رہو؟ آخر ان رسالوں کیلئے اپنی اوقات کب تک برباد کرو گے؟ نیرنگ خیال کا سالنامہ نکلے تو تمہیں فکر عید نمبر نکلنے والا ہو تو تمہیں خیال، نیرنگ کا خاص نمبر نکلے تو تم ہمہ تن متوجہ بھلا تم کون ساری جہاں کا درد تمہارے جگر میں کیوں؟ دس سال سے اپنی اوقات انہیں پرچوں کے پیچھے خراب کر رہے ہو، آخر کوئی فائدہ ہوا ہو تو بتاؤ، اسوا اسکے کہ اور غلط فہمیاں بڑھ گئیں کچھ دنوں تو تو میں میں ہوتی رہی اس کلموہے محتسب نے احتساب لکھ مارا، تم نے اس کا حلیہ لکھدیا، یوں چلتی رہی مضمون نگاری کیلئے روپیہ برباد، اوقات خراب، کام خراب اور پھر فائدہ ندارد، اورنگ آباد کے ایک ہنیں دو چکر کاٹ کے کیا تو کیا کیا کہ ایک مضمون "اورنگ آباد اور اسکے نواح" کے عنوان سے لکھ مارا اور پندرہ روز اور روپیہ پیسہ خراب کر کے دولت آباد، خلد آباد، ایلورا کی خاک چھانی اور ہاتھ کیا آئے تو دو مضمون جن میں ایک مضمون پر اس لمبوترے کلموہے نے احتساب بھی لکھ دیا، گلبرگہ کے قلعہ اور گنبد کی اینٹ سے اینٹ بجادی، آٹھ سال وہاں رہکر ایک ایک چیز دیکھتے رہے، تاریخ بھی لکھی مگر وہ تو چھپوانی نصیب نہ ہوئی البتہ ایک مضمون لکھ مارا چلو بڑا کام کیا۔

رنگین، انشاء، قیس، جان صاحب کی ریختیوں کو سکندر نامہ کی طرح پڑھ پڑھ کر بازاری محاوروں کو سمجھنے کی خاطر ہندوستانی طوائفوں سے اختلاط پیدا کر کے دو تین مضمون ریختیوں پر لکھے تو کیا ہوا، کونسا خان بہادری کا خطاب

اور پنج ہزاری منصب مع پالکی جھالر دار ملا؟ ادبیات اور تاریخ میں اس قدر سر کھپا کر اتنے مضمون لکھکر کیا فائدہ ہوا، افسانے لکھ لکھکر کونسے خطاب پائے؟ کسی چیز سے بھی کوئی فائدہ ہوا ہو تو بتاؤ سوا نقصان کے اور کچھ نہیں، لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ بیگم! تمہارے شوہر خدا رکھے حسین خوشرو، پڑھے لکھے، مضمون نگار، لائق اور مشہور اور نیک ہیں خدا ہر ایک لڑکی کو ایسا شوہر نصیب کرے، میں یہ سنتی ہوں اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہوں، خوش رو اور حسین شوہر کو لیکر کیا کروں جبکہ وہ مجھ سے دن بھر میں دو چار وقت بھی بات نہ کرتا ہو، پڑھے لکھے مضمون نگار اور لائق شوہر سے کیا فائدہ جبکہ مضمون نگاری سے اُسے فرصت ہی نہ ملتی ہو اور وہ میری طرف متوجہ ہی نہ ہوتا ہو۔ ایسی شہرت کو آگ لگے جسکی خاطر انسان بیوی کو بھی بھول جائے، ایسی نیکی بھاڑ میں جائے جو سب کے لئے نیکی ہو اور گھر کی بیوی کیلئے بدی سے بدتر، کاش تم پڑھے لکھے نہ ہوتے مضمون نگار نہ ہوتے، مشہور نہ ہوتے، بالکل جاہل، لکھنے پڑھنے کے نا قابل نہایت ہی گمنام بہت ہی بدصورت، بڑے ہی بد مزاج ہوتے مگر مجھ سے سیدھی طرح رہتے جب تک گھر پر رہتے مجھ سے مخاطب رہتے واللہ مجھے دنیا ملجاتی دنیا!"

ہم نے لاکھ لاکھ ضبط کیا مگر طبیعت نکل ہی گئی خصوصاً آخری جملے پر۔ آگ سی لگ گئی، ہم نے ڈانٹ کر کہا،

"ہم خوشرو ہوں، لکھے پڑھے ہوں، مشہور ہوں، نیک ہوں اور تمہارے لئے

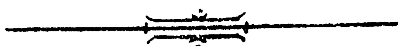
بد سے بد تر ہوں تو تم خوشی سے کسی جاہل، نا قابل، گمنام، بدصورت، بدمزاج رات دن تم سے باتیں کرنے والے کو ڈھونڈ لو تمہیں دنیا مل جائے گی، ہم یوہنی لنڈورے بھلے۔"

ہمنے کہنے کو تو غصے سے کہدیا مگر "وہ" بے تحاشا ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگیں، ہماری کرسی کے دستے پر سر رکھدیا، آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے کرسی کے دستے پر گر کر گدے پر گرنے لگے ہم چاہتے تھے کہ اسی حالت میں "انہیں" چھوڑ کر باہر چلدیں مگر قدم نہیں اٹھتا تھا لاکھ لاکھ چاہا کہ خاموش ہی بیٹھے رہیں مگر یہ بھی نہ ہو سکا، ریچرڈ ہنری سیوج نے سچ کہا ہے کہ "لوہا ہے کو بیشک نرم کر سکتا ہے مگر مرد کا جوش عورت کے غصے کو ہرگز فرو نہیں کر سکتا" اور عورت کے معاملہ میں ایسا کون آدمی ہوگا جو قاعدے اور اصول کا پابند رہ سکا ہو، ہم اٹھ کھڑے ہوئے "انہیں" اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا، دلاسا دیا، تشفی دی، کچھ سمجھایا، ذرا گدگدایا، انتہا یہ کہ "مورا جیکلے میں جی گھبراوت ہے" گا کر ہنسا ہی دیا، ہنری مارٹین نے کس قدر ٹھیک کہا ہے کہ "مرد بالخصوص اس زمانے میں جبکہ اسکی بی بی کا عنفوان شباب ہوتا ہے اور اولاد بہت صغیر سن ہوتی ہے بہ نسبت "بہترین باپ" ہونیکے وہ بہترین شوہر قدرتی طور پر ثابت ہوتا،" پھر چلیت پھرت معلوم ہونے لگی، خوشدامن صاحبہ اپنے دالان کی طرف مسکراتی ہوئی تشریف لے گئیں دو ڈومنیاں ڈرتی ہوئی اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں، چھوکریاں اور انا جی، آپا بھی رفو چکر ہو گئیں!

ہم نے "انکا" منہ دھلوایا گلنار ناشتہ لائی پھر ہم دونوں نے ملکر ناشتہ کیا "ننھا" ابھی آگیا اور وہی اباّ اماں روٹی کہکر یا پڑ کھانے لگا، چائے پیتے ہوئے ہم نے ہنس کر کہا "منیّ! اجازت دو تو ذرا مضمون ختم کرلیں نیرنگ کو بھیجنا ہے" تو ہنسکر کہنے لگیں "ابھی تم کو اتنا کہا مگر کچھ اثر نہ ہوا، اچھا لکھ لو میں نہا کر کپڑے بدل لیتی ہوں"

ادھر وہ نہانے گئیں اور ادھر ہم نے مضمون لکھ لکھا کر ختم کرلیا۔

یہ ہے ایک گھریلو زندگی کا نقشہ، یہ ہے ہم مضمون نگاروں کی زندگی، یہ ہے ہم پڑھے لکھوں کی خرابی، یوں مضامین لکھتے ہیں اس طرح رات بھر غائب رہتے ہیں۔ یوں اثر ڈالنے کی فکر کرتے ہیں، اور پھر ایسے دبجاتے ہیں، کہیئے پھر مضمون لکھا جائے تو کیونکر اور خوش مذاقی سوجھے تو کس طرح ہمنے جاں پر کھیل کر سارا قصہ لکھ تو دیا مگر خدا نہ کرے کہ یہ مضمون طبع ہوکر "بیگم صاحبہ" کی نظر سے گذرے ورنہ قیامت ہی آجائے گی۔



ہم اور ہماری عید

عید کی خوشی ہر اُس شخص کو ہو سکتی ہے جو حقیقی معنوں میں روزہ دار ہو مگر ہمارے نزدیک عید کو روزوں سے اسی قدر تعلق ہوتا ہے جس قدر کہ ہمارے سیاسی لیڈروں کو حقیقت و صداقت خلوص اور ہمدردی سے یعنی ان میں سے کوئی چیز بھی انکے پاس نہیں مگر وہ ہیں لیڈر اسی طرح ہم نے ایک روزہ بھی نہیں رکھا مگر عید منانے تیار ہو گئے۔

۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو ½ ۹ بجے رات کو ہم مکان پہنچے تو عجب چہل پہل تھی۔ بچوں کی چیخ پکار بڑوں کی ہنسی، بوڑھوں کی دوڑ سب ملکر ایک عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہم نے کھانا کھا کر سونے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ہماری چھوٹی سالی صاحبہ آدھمکیں اور مجبور کر کے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کو مہندی لگا گئیں، بارہ بجے رات تک نداق دل لگی کر کے کہتی گئیں کہ اس عید کے تحفے میں ایک کروشیا کا سیٹ لونگی۔ ہماری بیگم صاحبہ اپنی والدہ کے پاس تھیں۔ نہ جانے کیا کیا انتظامات

ہو رہے تھے ہم نے ابھی خوابگاہ کا رُخ نہیں کیا تھا کرسی سے اٹھ کر انگڑائی ہی لے رہے تھے کہ "وہ" آگئیں، کہنے لگیں "کہو تو سہی ہم کل کیا پہنیں"۔ ہم نے کہا خدا کیلئے کچھ نہ پہنو ایک عید یونہی بغیر پہنے اوڑھے سہی۔ کہنے لگیں "ہیں تم کو تو مذاق سوجھ رہا ہے"! ہماری شادی کے بعد سے کپڑے لتوں پر ہمیشہ لڑائی ہونے لگی اسکی وجہ یہ تھی کہ بعض رنگ جو ہماری بیگم صاحبہ کو پسند تھے ہمیں پسند نہ تھے اور بعض جو ہمیں پسند تھے اُنہیں ناپسند تھے، آخر میں یہ تصفیہ ہوا کہ ہم ان کے پسند کردہ کپڑے پہنا کریں اور وہ ہماری خواہش کے موافق لباس پہنیں۔ اسمیں شک نہیں کہ اس سے چند روز تک دونوں کو سخت کوفت ہوئی مگر رفتہ رفتہ عادت ہو گئی اب ہمیں وہ جو پہناتی ہیں ہم پہن لیتے ہیں اور ہم انہیں جو پہناتے ہیں وہ پہن لیتی ہیں۔ بعض خاص خاص موقعوں پر ایک دوسرے سے اجازت لیکر من مانے رنگ کے کپڑے بھی پہن لیتے ہیں۔ مگر ایسا اتفاق سال میں دو ہی تین بار ہوتا ہے۔ خیر

"انہوں" نے ہمارے لئے لیس، او، کا ایک پاجامہ، اودی دھاری دار سفید ریشمی شیروانی، زفر کی سُرخ قمیص، باریک جالی دار نیم آستین نکالکر باہر رکھ دیا، دستی پاتابے اور جوتے ٹوپی کا انتخاب بکمال سرفرازی ہمیں پر چھوڑ دیا گیا، ہم نے "اُن" کے لئے نافرمانی رنگ کی ریشمی ساڑھی اور ہلکے آسمانی رنگ کا کرتا پسند کیا اور بقیہ کپڑوں کا انتخاب انہیں پر چھوڑ دیا، اس "کپڑوں کے انتخاب"

میں تین بج گئے، ہم نے چار بجے خوابگاہ کی صورت دیکھی، ٹھیک ساڑھے پانچ بجے بجنا ور نے دروازہ ٹھونک ٹھونک کر جگا دیا، ہم نے آواز سنی اور کروٹ بدل لی البتہ "وہ" اٹھ بیٹھیں انگڑائیاں لیں، لباس درست کیا اور پلنگ سے اتر کر کھڑی ہو گئیں لحاف کھینچ کر پھینک دیا اور لگیں ہمارے گال پر ستار کی مشق کرنے یعنی انگلی سے آہستہ آہستہ مارنے۔ ہم نے جب بھی آنکھیں نہیں کھولیں تو ناک کے دونوں نتھنے پکڑ کر بند کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا سانس رک گیا اور ہم نے بکمال اضطراب آنکھیں کھول دیں اور ہنسی خوشی اٹھ بیٹھے۔ ضروریات سے فارغ ہوئے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا اور کمرے میں آکر بیٹھ رہے۔ ننھے میاں طوعاً بھی اناّ کی گود سے اتر کر کرسیوں اور دیوار کا سہارا لیتے ہوئے آپہنچے اور لگے ہمارے گھٹنوں کے سہارے کھڑے ہو کر اول جلول بکنے اسی اثنا میں ناشتہ آگیا اور وہ بھی آگئیں اب ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے باپ ناشتہ کر رہا ہے بچہ ہاتھ بڑھا کر کچھ مانگتا ہے تو باپ ایک آدھ نوالا منہ میں ٹھونس دیتا ہے ماتا کی ماری ماں مسکراتی ہے اور.........

ناشتہ ختم کر کے ہم نے ٹھیک ½ ۸ بجے قمیص پر عطر ملا دستی کے کونوں پر بھی لونڈر چھڑکا اور بن سنور کر چلے گھر سے پڑھنے کو نماز عید کی۔ مگر چار بینار تک آکر خیال آیا کہ اگر عید گاہ جائیں تو راستہ میں بھیڑ بھاڑ زیادہ رہے گی واپسی میں بھی زحمت ہو گی، بہتر یہ ہے کہ کسی اور مسجد میں نماز پڑھ لیں پھر یاد آیا کہ

محلے کی مسجد میں نماز پڑھ لیں۔ پھر یہ بھی خیال ہوا کہ اب کہاں کی نماز کہدینگے کہ
عیدگاہ میں نماز پڑھ لی اب چلو لگے ہاتوں چند لوگوں سے مل لیں، بس اس
آخری فیصلہ پر عمل کرنے کیلئے ہم نے سائکل موڑی اور سیدھے قطبی گوڑہ جا پہنچے
وہاں سے مل ملا کر نکلے تو دس بج چکے تھے راستہ میں جس قدر ملاقاتیوں اور
دوست احباب کے مکان ملے ہم نے سبھوں سے ملاقاتیں کیں آخر میں
عبدالحق کے پاس پہنچے عید کا روز تھا عبدالحق صاحب نے مکتبۂ ابراہیمیہ کو
تعطیل دے رکھی تھی۔ وہاب بھی موجود تھے بہرحال دوپہر کا کھانا وہیں "تناول"
ہوا مغرب تک گپ ہوتی رہی مغرب کو چائے پی کر سینما پہنچے ½۸ بجے رات تک
سینما دیکھا اور تھیٹر سے نکل کر وہاب اور عبدالحق کو خدا حافظ کہتے ہوئے گھر کی
طرف چلے ابھی ہم افضل گنج کے پاس ہی پہنچے تھے کہ میاں غضنفر علی نے روک لیا
اور نہ صرف روکا بلکہ زبردستی ساتھ لیکر گھر کا رخ کیا ہمارا خیال تھا کہ مکان پر
دس پندرہ منٹ ٹھہر کر واپس ہو جائیں گے مگر وہاں پہنچتے ہی تو "علی غول"
موجود "یارانِ نجد" کا مجمع، رات کا کھانا بھی وہیں ہوا اور پھر گانا شروع ہوا۔
"چمپا" واقعی اچھا گاتی ہے "جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے" والی غزل
اس نفاست سے بتا کر گائی کہ واہ معلوم ہوتا تھا کہ واقعی زمین و آسماں دونوں
چل رہے ہیں۔ حضرت جلیل یقیناً موسیقی کے ماہر ہیں جبھی تو ایسی غزل کہی جو
بتا کر گانے کیلئے ہر طرح موزوں ہے خیر ۱۱ بجے سے صبح کے ۴ بجے تک گانا

ہوتا رہا اس اثنا میں گھر جانے کا خیال ہی نہیں آیا، صبح گھر چلنے کی فکر کی تو فدا حسین نے ناشتہ کر کے جانے پر مجبور کیا مجبوراً یہ بھی کرنا پڑا، ۹ بجے بدقت تمام غضنفر علی کے گھر سے چلے، میر عالم کی منڈی کے پاس میاں رشید مل گئے۔ معہ احباب سمیت، گنڈی پیٹ کے تالاب کو جا رہے تھے ہمیں جو دیکھا تو موٹر روک پکڑ ہی لیا کہ چلو، لاکھ لاکھ کہا کہ بھئی کل صبح کا گھر سے نکلا ہوا ہوں جانے بھی دو، مگر کون مانتا سیکل اُن کے حوالے کر کے موٹر میں بیٹھنا پڑا اور چلے طرف گنڈی پیٹھ کے۔ راستہ میں یاروں نے ارادہ بدل کر حمایت ساگر چلنے کی ٹھان کی جوں توں کر کے تالاب پر پہنچے، دوڑنے کی مشق ہوئی، تیرنے کی شرطیں ہوئیں، گانے کا مقابلہ ہوا، تاش کھیلا گیا، بیت بازی ہوئی "صنم آمد" کا بھی شغل رہا، کھانا کھایا چائے پی، مچھلیوں کا شکار ہوا، سات بجے شام کو ڈاک بنگلے میں آکر بیٹھ رہے ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ اب واپس ہونگے۔ پوچھا تو رشید نے بکمال متانت جواب دیا کہ "ابھی چلتے ہیں" مگر ۸ بجے ایک موٹر آیا جس میں ایک "منواں" کی (وہاں یہ لہجۂ خاص) بی صاحبہ تشریف فرما تھیں انکے سازندے اور سنگتی بھی ورلی طرف ہی کے تھے وہ سیدھی ڈاک بنگلہ پر ٹھہر گئیں۔ ایک صاحب نے بڑھ کر انہیں بلا لیا اور اب وہ ہمارے سامنے گول میز کے پاس آرام کرسی پر گھبرائی ہوئی سی بیٹھی تھیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ "بی صاحبہ" چند ہی روز ہوئے آئی ہوئی ہیں رہنے والی یو پی کی ضرور ہیں مگر اپنے آپ کو خاص

لکھنؤ والی ظاہر کرتی ہیں اور میاں رشید کی بلائی ہوئی تشریف لائی ہیں بس ہمارا خون ہی خشک ہو گیا۔ خیال کیجئے، عید کی نماز کو گھر سے چلے تھے سارا دن گذر گیا رات گذر گئی دوسرا روز بھی آ گیا اب دوسری رات کی باری تھی گھر پر ہنگامہ ہوگا خدا ہی بہتر جانتا ہے، واللہ خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہو گئے حضرت ہم ٹھہرے "رسی ڈنٹ ممبر" یعنی گھر داماد، اب غور فرمائیے کہ ہم پر کیا کیا آفتیں نہ آئی ہونگی اور اسطرح غائب رہنے سے ہماری کیا گت بنے گی۔

ایک تجربہ کار، ستم‌ہائے زوجہ و خوشدامن و خسر دیدہ، طمانچہ ہائے سالیاں چشیدہ" گھر داماد، کی حیثیت سے ہم تمام اپنے گھر داماد و خانہ داماد بھائیوں کو وصیت کرتے ہیں کہ بھائیو! اگر خیر چاہتے ہو تو ہر طرح جورو کے غلام بنے رہو، دوست احباب کو چھوڑ دو، گانے کے جلسوں کو سلام کر دو تھیٹر اور سینما دیکھنے کی قسم کھالو، دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر تک جایا آیا کرو اور بس، جورو جو کھلائے کھاؤ، اور خسر اور خوشدامن جو پہنائیں پہنو، جو حکم ملے "جنرل آرڈر" سمجھ کر تعمیل کرو ورنہ یاد رکھو اتنی بے بھاؤ کی پڑیگی کہ چاند پر ایک بال نظر نہ آئے گا۔...............

ڈاک بنگلے کے بیچ کے بڑے ہال میں دسترخوان بچھا سب نے ملکر تناول ما حضر سے عنداللہ ماجور" ہونے کی کوشش کی بلکہ بعض تو خوب مشکور ہوئے، اتفاق سے بی..........جان ہمارے مقابل تشریف فرما تھیں دوران

تکلف میں کبھی ہم نے سالن کا کٹورہ انکی طرف بڑھا دیا اور کبھی انہوں نے بریانی کا ڈش ہماری طرف ڈھکیل دیا کبھی ہم نے بگھارے بینگن انکی پلیٹ میں جھونک دیئے، انہوں نے کھیر کی پیالی ہماری رکابی میں الٹ دی بہرحال اس تکلف نے بے تکلفی کی صورت اختیار کی کھانے سے فارغ ہونیکے بعد صرف ایک ہم ہی ہم تھے جو اُن سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ پیش آرہے تھے اُن کے پاندان کا پہلا پان ہمیں کو ملا اور وہ بھی اس شان سے کہ خود آں محترمہ نے اپنے دست نازک سے ہمارے ہونٹوں میں دے دیا جو بیگم صاحبہ کے خوف سے تھرّا رہے تھے بلکہ قدرے زرد بھی تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم واقع ہوئے ہیں بہت ہی بے تکلف بلکہ بقول..... کے "فاسٹ ورکر" ادھر آنکھ ملی اور اُدھر ہم نے سلام کیا ادھر سلام کیا ادھر مصافحہ ہوا کہ وہ ہنسے اور ہنسنا ہی تھا کہ ہم نے کچھ کان میں کہا ادھر سے انہوں نے بگڑ کر صلواتیں سنائیں اور ہم نے مسکراتے ہوئے کانا پھوسی کی تو بس کُھل گئے، الٹے ہاتھ سے ایک "مہین سا" طمانچہ رسید کر دیا، چلو ہم گال سہلاتے ہوئے بازو بیٹھ گئے پھر کیا ہے۔

ہمیں ہم ہیں زمیں سے آسماں تک

مگر یہ سب باہر ہوتا ہے گھر پر کچھ پیش نہیں جاتی۔ ہائے

ہمیں جی رو کو اپنے دام میں لانا نہیں آتا   بنانیوالے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

بہرحال، المختصر، بلا بہ، فی الحقیقت میں، امر واقعہ، یہ ہے کہ بی صاحبہ کی آنکھیں غضب تھیں گو،

وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

مگر آہوئے وحشی کم از کم مجھ مجنوں منش سے رام تھا، بس پھر کیا تھا گھر کی یاد یک قلم فراموش ہوگئی اتنا خیال ہے کہ گانا شروع ہوا

اتنا تو مجھے یاد ہے کہ کچھ گاتی تھی ......

کیا گاتی تھی .... مجھے کچھ یاد نہیں ہے

صبح گانا ختم ہوا تب کہیں مجھے ہوش آیا۔ انہوں نے کہا کہ چلو ذرا تالاب ہمیں دکھا دو ہم نے کہا زہے نصیب ساتھ لے کر چلے صبح کا وقت، سرد سرد ہوا چل رہی تھی رات بھر کی تھکن اور نیند کا خمار، ظالم کی مخمور آنکھوں کو اور بے پناہ بنا رہا تھا، نہ جانے میں نے کیا کہا اور انہوں نے کیا جواب دیا کہ میں نے ان مخمور آنکھوں کو چوم لیا، اگر چند لوگ ناشتے کیلئے نہ بلانے آتے اور ہمیں اس طرح "منسلک" دیکھ کر شور وغوغا نہ کرتے تو نہ جانے کیا کچھ ہوتا، خیر یہ گذری کہ ان حضرات نے ہمیں زبردستی ڈاک بنگلے میں پہنچا دیا، ناشتہ ہوا، زر خوب ہوا، رشید نے واپسی کی تحریک کی اور کہا کہ ۱۱ بجے واپس ہونا چاہیے۔ مگر یہاں کون مردود اس قدر جلد واپس ہونا چاہتا تھا، میں نے کہا کہ دو بجے "قلعہ" جانا ہے میرے لئے "فون" کر کے ایک کار منگوا دو ڈیڑھ بجے میں قلعہ

جاؤں گا اور تم لوگ گھر چلے جاؤ رشید نے اسے منظور کر لیا اور چار کسی موٹر والے کیلئے "فون" کیا گیا، بی صاحبہ نے اس "قلعہ" جانے کی علت کو میری امیدوں کے خلاف بہت جلد بھانپ لیا کہنے لگیں "اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں بھی ساتھ چلوں مجھے بھی قلعہ دکھائیے" میں نے فوراً انکار کر دیا کہ مجھے فلاں صاحب سے ملنا ہے فلاں کے گھر جانا ہے مگر رشید وغیرہ نے مجبور کیا کہ "اماں! لے بھی جاؤ تم باہر بیٹھے جانا پردے لگا کر انہیں اندر بٹھا دو، تم جن سے بھی ملو گے آخر موٹر میں تو بلا کر انہیں ملو گے، جلد مل لینا یہ موٹر میں ٹھہری رہیں گی نہ جانے پھر اس طرف ان کا آنا ہو یا موقع نہ مل سکے یہ بھی قلعہ دیکھ لیں گی مشہور جیز ہے ہم نے بھی مفت کرم داشتن کے تحت منہ بنا کر رشید کے مشورے کو قبول کر لیا، ڈیڑھ بجے چلے، تھوڑی دور تک تو ہماری موٹریں ایک دوسری کے پیچھے پیچھے چلتی رہیں مگر پھر راستہ بدلنا پڑا ہم ایک طرف روانہ ہوئے اور رشید وغیرہ دوسری طرف قلعہ گئے کسی سے ملنا تھا ہی نہیں اور نہ ملنے کو جی چاہتا تھا وہ تو ایک بہانہ تھا اُن حضرات کو رخصت کرنے کا قلعہ دکھایا اور پھر اسی ڈاک بنگلے کو لوٹ آئے جس میں ایک رات اور آدھا دن بسر ہو چکا تھا۔ رات کا کھانا ہم دونوں نے ملکر تناول کیا اور سو رہے صبح سویرے ناشتہ کیا تالاب کی سیر کی اور ۹ بجے وہاں سے نکلکر........ پہنچے یہ چشم پُر نم انہیں رخصت کیا دوسرے روز ملنے کا وعدہ کر کے چلے مگر مشکل یہ تھی کہ روپئے سب ختم

ہو چکے تھے ؛...... کے پاس جاکر روپئے لئے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا" کروشیاہ کا ایک سٹ چھوٹی سالی کیلئے لیا، بیگم صاحبہ کیلئے بھی دو تحفے لئے بچے کیلئے کھلونا خریدا اور تانگے میں لدے ہوئے گھر پہنچے "جل تو جلال تو" کا ورد کرتے ہوئے۔ تانگے سے اترے رستم علی نے آکر کھلونا وغیرہ آتارا ہم اندر پہنچے دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے کمرے میں "قل پنج" ہے، خوش دامن صاحبہ سے لیکر مامائیں اور چھوکریاں تک یہیں جمع ہیں ہمارا "ننھا" بیچوں بیچ آنکھیں بند کئے پڑا ہوا ہے، سرہانے بیگم صاحبہ تشریف فرما ہیں، اس کے پائیں میں خوشدامن صاحبہ بیٹھی ہیں دونوں بازوں پر ہماری دونوں سالیاں ہیں، چھوکریاں بھی کھڑی ہوئی ہیں ہم نے کمرے میں داخل ہوکر خوشدامن صاحبہ کو سلام کیا اور بس مگر بڑی بی نے خلاف معمول نہ تو بلائیں لیں اور نہ دعا ہی دی صرف چھوکریوں اور ماماؤں نے ایک ایک بندگی کرکے فرار ہونا شروع کیا، سالیوں نے دیکھا تک نہیں البتہ دوپٹے کے پلو سر پر کھینچ کر سیدھی ہو بیٹھیں "وہ" البتہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔ دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے آنکھ سے نکلکر رخساروں پر سے گرتے ہوئے ٹھوڑی کے پاس آکر "بہ اندازِ چکیدن سرنگوں" ہو گئے ہم نے نہایت سراسیمگی سے آگے بڑھکر ننھے کی نبض دیکھی معمولی بخار تھا تھرما میٹر لگا کر ٹمپریچر لیا تو صرف ایک سو ایک ڈگری بخار تھا کمرے کا یہ حال تھا کہ ایک طرف انگیٹھی دہک رہی تھی دروازے بند اور ننھے کو دو موٹی موٹی

بلانکٹیں اڑھائی گئیں تھیں سب سے پہلے ہم نے انگیٹھی اُٹھوادی، دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں۔ ننھے کے پاؤں سے دونو بلانکٹیں اُتار کر پھینک دیں اسٹانڈ پر سے توال لیکر ٹھنڈے پانی سے بھگویا اور اس کے سر پر ڈال دیا، چار پانچ منٹ کے بعد ننھے نے کروٹ بدلی اور پھر آنکھیں کھول کر ناتواں آواز میں پکارا "ابا!" ہم نے گود میں اٹھالیا، پہلے تو اس نے پریشانی سے گھورنا شروع کیا اور پھر گلے سے لپٹ کر لگا رونے ہم نے سمجھایا کھلونے لانے کا تذکرہ کیا، سخاوت کو بھیج کر رستم علی کے پاس سے کھلونے منگوائے، ریل، کبوتر، بندوق، ڈھولن، بانسری دیکھ کر ننھا گود سے اتر پڑا۔ اور لگا ہنسنے پھر ذرا بندوق چلانے کی کوشش کی۔ کبوتر کو داب داب کر اُس کی آواز سُنی۔ اور ڈھول پیٹا، بانسری کو بھی دو ایک بار پھونکا، کنجی دیکر ریل کو اِدھر اُدھر دوڑایا، ننھے کو اٹھکر کھیلتے دیکھ کر بڑی بی کے ہونٹوں پر تبسم کی لہر دوڑ گئی اور وہ آہستہ سے اُٹھ کر چلی گئیں بیگم صاحبہ منہ ہی منہ میں بڑاتی ہوئیں کرسی پر جا بیٹھیں۔ دونوں سالیاں بھی ایک ایک کرکے کھسک گئیں، آپا البتہ ٹھہر گئی ننھا جب ریل سے اکتا گیا تو بندوق لیکر آپا پر پل پڑا مجھ سے کہنے لگا "ابا آپا کو ماروں" میں نے کہا بیٹا وہ مرجائے گی" کہنے لگا سلے ویسا نہیں ماروں گا" میں نے کہا زندہ رہی ویسا مارو، آپا نے آگے بڑھکر بلائیں لیں۔ اور بندوق سمیت گود میں اٹھا کر پیار کیا، ہم نے دودھ منگوا کر ننھے کو پلایا اس کے بعد وہ اطمینان سے کھیلنے لگا۔ پھر جو ٹمپریچر دیکھا تو ۹۸ تھا، بات

دراصل یہ ہوئی کہ دو دن ہیں نہ دیکھ کر اس نے رونا شروع کیا اور اسی رونے دھونے میں بخار آگیا، بجائے اسکے کہ اُسے بہلا پھسلا کر رونے سے باز رکھا جاتا اور بخار کیلئے کوئی دوائی دی جاتی، عقلمندوں نے پلا دیا جلاب اور پھر کمرے کے دروازے بند کرکے انگیٹھی جلا کر دو دو بلانکٹ اڑھا کر اور ہوا بند کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بخار اور بڑھ گیا۔ اگر ہم وقت پر نہ پہنچتے تو معلوم نہیں ننھے میاں رہتے یا اسی کمسنی میں "نوجوان والدین کو داغ مفارقت" دے جاتے۔

ننھے میاں کی آیا ہے بڑی سمجھدار۔ جب ہمیں بے چین دیکھی تو ننھے میاں کو مع کھلونوں کے گود میں لے اسکی خالہ کے کمرے کی طرف چلے گئی ہم نے بکمال اطمینان بیگم صاحبہ کا غصہ اتارنا چاہا، گُدگدایا، چھیڑا، چٹکیاں لیں۔ منت و خوشامد کی دنیا بھر کی باتیں کیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں آخر ہم تھک کر بیٹھ گئے یہ ہماری طرف سے اعترافِ شکست تھا، جب ہم نے ہار مان لی تو بیگم صاحبہ نے کرسی سے اٹھ کر ہماری طرف دیکھا آنکھیں سوجھی ہوئیں تھیں آنسوؤں کے قطرے کچھ آنکھوں کچھ گالوں اور کچھ تھوڑی پر بکھرے ہوئے تھے ہچکیاں لے لے کر انہوں نے عید کی رات سے ننھے کو بخار آنے اور اسکے بیہوش ہو جانے کا قصہ سنایا، اس کے گھڑی گھڑی ابا ابا کہہ کر چونک اٹھنے کو خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا۔ اور نتیجہ میں ہماری بیوفائی، بچے سے نفرت گھر سے غائب اور دوستوں میں جلسے اڑانے پر خوب صلواتیں سنائیں، ہم نے

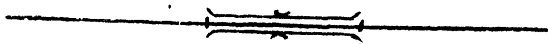
ایک ہی سانس میں بیس بائیس بہانے بنائے مگر انہیں پورے واقعات کا علم تھا۔ رشید میاں کے ملازم نے باوجود منع کرنے کے سائیکل گھر پر لاکر دے دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ ہم رشید میاں کے ہمراہ گنڈی بیٹھ گئے ہیں وہاں جلسہ ہے رات کو گانا ہوگا، دوسرے روز میاں یحییٰ ملنے آئے تھے۔ رستم علی نے ان سے کہا۔ کہ میاں تو عید کی صبح سے غائب ہیں تو انہوں نے کہدیا کہ اجی عید کی رات کو تو غضنفر علی کے پاس جلسہ تھا، رات بھر وہ بھی ہمارے ساتھ چمپا کا گانا سنتے رہے صبح ناشتہ کر کے گھر کی طرف گئے تھے معلوم نہیں رستے سے کہاں غائب ہوگئے، عید کے دوسرے روز پاشا بھائی ملنے آئے تھے اُنسے ہماری بیگم صاحبہ نے ہمارے غائب ہونیکا قصہ فرمایا تو انہوں نے کہدیا کہ میں نے عید کے روز اسلیٹی آر کے فسٹ شو میں انہیں دیکھا تھا، بیگم صاحبہ کو یہ ساری باتیں معلوم ہوئیں تو انہوں نے کڑیاں ملاکر عید کی دوپہر عبدالحق کے ہاں بسر کرنا، شام سے سینما دیکھنا، رات کو چمپا کا گانا سننا دوسرے روز صبح وہاں سے چلنا راستہ میں سائیکل ملازم کو دے کر موٹر میں گنڈی بیٹھ جانا سب معلوم کرلیا، تیسرے روز رشید کے گھر پر آدمی بھیجکر دریافت کرایا تو پتہ چلا کہ ہم قلعہ دیکھنے چلے گئے تھے۔ رشید واپس ہوگئے ہیں۔ رستم علی سے کسی نے یہ بھی کہدیا کہ ہمنے موٹر میں ایک بی صاحبہ کو بھی ساتھ لے لیا تھا، یہ اطلاع بھی پہنچ گئی۔ بہرحال ہماری پوری کارستانیاں سوا آخری رات کے واقعات کے

معلوم ہو چکیں تھیں۔ اور آخری رات کے متعلق بیگم صاحبہ کو یہ یقین تھا کہ ہمنے اسی کے ساتھ قلعہ میں بسر کی جو ہمارے ہمراہ موٹر میں آگئی تھی۔ ہمارے جھوٹ بولنے کی کوشش بیکار ہوئی ایک ایک کرکے سب انہوں نے سنا دیئے، اب ہمارے لئے صرف ایک راستہ تھا۔ وہ یہ کہ معافی مانگ لیں اور آئندہ کیلئے وعدہ کرلیں، ہم نے مجبوراً بادل ناخواستہ یہ بھی کیا، انہیں کی قسم کھائی کہ آئندہ کسی عورت سے نہ ملیں گے۔ اور بلا اجازت کسی جلسے میں نہیں جائینگے ایک گھنٹہ کی منت و خوشامد کے بعد کہیں ان کے آنسو تھمے۔ اور انہوں نے "عید کی ملاقات" کی تین بجے کھانا نصیب ہوا کھانا کھا کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ اپنی والدہ بہنوں سے ہے کر ما ذں چھوکریوں تک سے ہماری اس منت و خوشامد اور قول وقسم کا تذکرہ کر دیا، دونوں نیک بخت سالیاں تو مدت سے ہم پر جلی ہوئی تھیں۔ انہیں موقع ہی ملا، ایک کو کروشیا کا سٹ اور دوسری کو "ٹینڈے" دے کر سمجھانا چاہا۔ مگر باوجود دونوں نے دونوں چیزوں پر قبضہ کرنے کے ہمارا شکریہ تک ادا نہیں کیا بلکہ بنائے گئیں ساڑھے پانچ بجے بڑی بی ٹہلتی ہوئی کمرے میں آئیں ہم نے پھر سلام کیا بلائیں لیں، دعائیں دیں، دالان میں سلامی کی کشتی رکھکر آئی تھیں وہ منگوا دی! اور جاتے جاتے "آج تو آپ کو گانے والے کی دعوت نہیں ہے" پوچھ کر ایک چرکا دیتی ہوئی تشریف لے گئیں۔ مگر ان کے آنے سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ہماری

دونوں نیک بخت سالیاں چپکے سے کھسک گئیں۔ بڑی بی نے خود جاکر بیگم صاحبہ کو بھیج دیا۔ ہم دونوں نے ساڑھے آٹھ بجے رات تک ترکی گنجفے سے دل بہلایا۔ پھر کھانا کھا کر سو رہے۔

خیر! یہ حال ہے ہم بدنصیبوں کا اور یوں ہوتی ہے "خانہ داما دونکی عید"

"برسرِ دامادِ آدم ہرچہ آید بگذرد"



ہم مضمون کیوں نہیں لکھتے

ہمارے لئے سب سے آسان کام دو ہیں۔ ایک تو مضمون لکھنا اور دوسرے گلی کوچوں میں پھرنا۔ مگر بدنصیبی دیکھئے کہ یہ دونوں کام ہم کر نہیں سکتے۔ ادھر ہم نے کھنکارتے ہوئے سگرٹ جلایا اور کرسی کھینچ کر میز کے سامنے بیٹھنے کا ارادہ کیا اُدھر "وہ" ہوشیار ہو گئیں۔ پہلے تو کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھا، کچھ مسکرائیں اور پھر ایک خاص انداز سے انگڑائی لے کر ہماری طرف متوجہ ہو گئیں۔ اگر ہم نے نہایت شرافت سے کرسی پر بیٹھ کر میز کو انگلیوں سے ٹھوکنا شروع کیا اور تال سُر سے ٹھیک ہو کر۔

جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

گانا شروع کر دیا تو انہوں نے نہایت متانت سے مسکراتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ ورنہ ہم میز پر سے کاغذ لیکر قلم اٹھانا چاہیں تو بس غضب ہو گیا۔ ناک بھوں چڑھا کر گھورنا شروع کیا، سانس پھول گیا، چہرے پر سرخی دوڑ گئی

ہونٹ کانپنے لگے اور انہوں نے تن کر دیکھنا شروع کیا۔ اس پر بھی اگر ہمنے
فونٹن پن سنبھال کر لکھنا ہی شروع کر دیا تو بس وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔
نہایت تیزی سے اٹھکر ہمارے برابر آ گئیں اور کھڑی ہو کر لگیں سروجنی
نائیڈو کی طرح نہایت فصاحت اور بلاغت سے خطبۂ صدارت ارشاد
فرمانے۔ مگر یہ خطبہ لیڈیز اینڈ جنٹلمین سے نہیں بلکہ "خبردار پھر تم نے لکھنا
شروع کیا" سے شروع ہوتا ہے۔ اگر اسوقت بھی ہم نے بکمال سعادتمندی
کاغذ رکھ دیا اور قلم پھینک کر انکی طرف توجہ کی اور دونوں ہاتھ مقام کر

تجھکو بٹھا کے سامنے یاد خدا کروں

گانا شروع کیا تو پھر اُن کا غصّہ بھی غائب، ورنہ خطبۂ صدارت بکمالِ
زور و شور جاری رہا۔ اس میں نہ تو کھدر پوشی پر زور دیا جاتا ہے اور نہ نمکخوری یا
قانون شکنی پر، بلکہ اپنے احسانات محبت، وفاداریاں اور خدمات گنائی
جاتی ہیں اور پھر ہماری احسان فراموشی، بے التفاتی، غیر وفاداری،
عدم توجہی، اور بے خبری وغیرہ عنوانات پر ایک بسیط نظر ڈالی جاتی ہے
جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں آئے ہوئے خیالات سب فو چکر ہو جاتے
ہیں اور ہم نہایت ہی سادہ لوح بنکر یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کس طرح
اس بلا سے نجات حاصل کیجائے۔ جب تک ہم کاغذ اور قلم پھینک کر
معافی نہ مانگ لیں وہ نہیں مانتیں۔

کہئے اب ایسی حالت میں ہم کیا لکھیں؟ بھیّا شاہد احمد مدیر رسالہ "ساقی" سے مدت ہوئی ہم نے وعدہ کیا تھا کہ "ساقی" کیلئے خوش مذاقی (لائٹ ہیومر) لکھنا ہمارے ذمے مگر یہاں لکھنے کی اجازت بھی تو ملے۔ ہمنے انہیں سمجھایا کہ دیکھو بھیّا شاہد ہمارے دوست ہیں جس زمانے میں مولوی بشیرالدین احمد مرحوم رائچور کے اول تعلقدار تھے اسی زمانے ہمارے والد مرحوم وہیں پر صدر خزانہ دار تھے۔ ہم دونوں کا بچپن ایک ہی جگہ گذرا۔ ہمارا فرض ہے کہ شاہد بھیّا کے رسالے کیلئے لکھتے رہیں مگر انہوں نے سب سنکر کہا تو یہی کہ کیا دنیا میں ایک آپ ہی مضمون نگار رہ گئے ہیں۔ آپ نہ لکھیں تو ساقی میں کوئی بھی نہیں لکھیگا؟ کہئے اب ہم کیا جواب دیتے؟

شاہد صاحب الگ بگڑے بیٹھے ہیں کہ ہم "ساقی" کیلئے کچھ نہیں لکھتے اور ان کے بھائی مبشر جدا خفا ہیں کہ باوجود مجبور کرنے کے مضمون نہیں بھیجتے شاہد صاحب کو ایسی مجبوری نہیں۔ ماشاءاللہ سے بھابی صاحبہ خود تعلیم یافتہ اور اونچی مذاق رکھتی ہیں "ساقی" یقیناً انکی اجازت سے جاری ہوا ہوگا!

مبشر صاحب تو بلاؤں میں پھنسے ہی نہیں کہ "زن مریدی" کیا چیز ہے؟ اسی لئے دونوں حضرات ہیں پر الزام دھرتے ہیں انہیں کیا معلوم کہ

ہماری بیوی ہم کو بات تک کرنے نہیں دیتی

اسکی وجہ یہ نہیں کہ وہ جاہل ہیں اجی حضرت وہ خاصی پڑھی لکھی ہیں۔ فارسی۔ اردو

اور تھوڑی تھوڑی انگریزی بھی پڑھ لیتی ہیں۔ فارسی میں مجلہ ارمغان' (طہران) کا
مطالعہ فرماتی ہیں۔ دیوان حافظ کا اکثر مطالعہ فرمانے کے علاوہ فال بھی دیکھ لیتی
ہیں۔ ایران کی اور مطبوعات بھی کبھی کبھار پڑھ لیتی ہیں اکثر فارسی کے شعر
یاد ہیں۔ کبھی ہم نماز پڑھتے ہیں تو گنگنانے لگتی ہیں ؎

چوں زمین بسجدہ کردم ززمین ندا برآمد
کہ مرا خراب کردی تو زسجدۂ ریائی

خیام نیشاپوری کی اکثر رباعیات برزبان ہیں۔

تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

تو بس وِرد فرماتی رہتی ہیں اور

ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

تو بس تکیہ کلام ہے۔ اسی طرح عربی کے جملوں کے جملے اور ٹکڑوں کے ٹکڑے ازبر ہیں
بھلا ایک دو ہوں تو گناؤں۔ مختصر یہ کہ بیوی صاحبہ عربی دانی
میں ابوالکلام کی ثانی ہیں تو فارسی دانی میں آقا داعی الاسلام کی ہم پلہ ہیں اردو
تو ماشاء اللہ مادری زبان ہی ہے لب ولہجہ ایسا عمدہ کہ

"آپ سنئے تو پھڑک جائیے گا"

بالکل پنجابی لہجہ "نے" کا استعمال غلط نہیں کرتیں مگر سخت لہجہ ضرور اختیار کر لیتی
ہیں یہ صرف ہم سے گفتگو کرتے ہوئے ورنہ کسی اور سے بات چیت ہوگی تو وہ

"ہنواں" کا لہجہ اختیار کر لیں گی۔ اور "ارے سے، ورے سے، ہنیاں اور ہنواں سے لیکر "کیچ" تک بولیں گی۔ اردو کا مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ شررکے ناول اور داستان امیر حمزہ کی ساتوں جلدیں اور پھر طلسم فتنہ نور افشاں، طلسم حیرت بالا باختر کوچک باختر ایرج نامہ۔ تورج نامہ اور نوشیروان نامہ سبھی چاٹ گئی ہیں سرشار کی تالیفات کا ملاحظہ بھی ہو چکا ہے حکیم محمد علی سے لیکر لکشمندت عابر اور کمندا گوہر کے ناول تک پڑھ ڈالے ہیں۔ تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمے اب بھی پڑھتی ہیں ظفر عمر کا ناول "لال کٹھور" طبع ہوا تو منگوایا مگر آدھے تک تہ پہنچی تھیں کہ پھینک دیا فرمانے لگیں "نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری" کے لکھنے بعد "لال کٹھور" جیسا ناول لکھکر ظفر عمر نے اپنی ادبی اسپرٹ کے تباہ یا مفقود ہو جانے کا اعلان کر دیا اب تو انکی اردو بھی لنگڑاتی ہے"۔ کہئے ایسی بے پناہ تنقید نگارہ کو کیا آپ جاہل سمجھیں گے؟

"وہ" اخبار صحیفہ، اخبار مشیر دکن اور اخبار رہبر دکن سبھی دیکھتی ہیں۔ صحیفہ کی مقامی میں ایک مبتلا وفوت اور چار مسافر وارد یا سمت افضل گنج میں ایک سائیکل سوار نے ٹکر دی تھی بر سر موقع گرفتار کر لیا گیا اور بوندا باندی، ابر آرائی وغیرہ دیکھ کر بہت خفا ہوتی ہیں انہیں تو ایسے جملے اور فقرے جو صحیفہ میں لکھے گئے ہیں، زبانی یاد ہیں۔ مشیر دکن کے لیڈنگ آرٹیکل سے تو انہیں نفرت ہے سارا اخبار پڑھ لیں گی مگر لیڈنگ آرٹیکل دیکھنا تک پسند نہیں کرتیں اخبار رہبر دکن

کے بعض مخصوص مقالے وہ غور سے پڑھتی ہیں مگر بعض تراجم کو ایک نوٹ بک میں درج کرنے کیلئے مجھے کہا کرتی تھیں "چو قومہ یا چو قومی" اور "وقت نامہ" وغیرہ الفاظ جو انگریزی الفاظ کے ترجمے میں انہیں یاد کر کے ہنستی ہیں یہی یہی یہ دلچسپ بدحواسیاں، چاہے وہ صحیفہ کی ہوں یا مشیر کی یا رہبر کی۔

یہ تھی انکی ناولی اور اخباری مصروفیت۔ اب ذرا رسالوی مصروفیت کو ملاحظہ فرمائیے۔ "معارف" سے لیکر بلند شہر کے رسالہ رفیق تک کو اور نور جہاں سے لیکر "عصمت" تک کو ہر مہینہ بلا ناغہ ملاحظہ فرماتی ہیں۔ آرٹ سے اس قدر ذوق ہے کہ "چاند" "نیرنگ خیال" "عالمگیر" وغیرہ کی رنگین اور عمدہ تصویروں کو رسالہ آتے ہی نکال کر فریم کرا کر دیوار پر لٹکا دیتی ہیں بعض انگریزی اخبارات کے "اینول" محض تصاویر کیلئے منگواتی ہیں۔ انگریزی صرف اس قدر جانتی ہیں کہ لفافے کا پتہ پڑھ لیتی اور تصویر کے نیچے کا نام سمجھ لیتی ہیں۔

کہئے اب تو آپ تعلیم یافتہ سمجھ لیں گے۔ نہ صرف یہی بلکہ حساب بھی لکھ لیتی ہیں۔ دھوبی کو کپڑے لکھ کر دیتی ہیں اور ہمیشہ دو تین کپڑے زیادہ لکھدیتی ہیں یا کم مگر لکھتی ضرور ہیں خط بھی خراب نہیں لمبے لمبے حروف بالکل ایسے ہی لکھتی ہیں جیسے کہ بہزاد ہند مسٹر چغتائی لکھا کرتے ہیں۔ شاعری سے بھی بہت لگاؤ ہے کبھی کبھی شعر بھی کہتی ہیں مگر سنانے سے نفرت ہے اساتذہ کے دواوین برزبان ہیں۔ خاقانی اور دلی سے لیکر اقبال اور فانی تک کا کلام سن لیجئے اکبر کے تو

سینکڑوں شعر یاد ہیں۔ خاصی انشا پرداز بھی واقع ہوئی ہیں مدت ہوئی آپ نے ایک کتاب بھوپال سے منگوائی تھی جس کے دو حصے تھے مگر وی پی کھولا گیا تو ایک ہی حصہ نکلا قیمت دونوں حصوں کی وصول کر لیگئی تھی اس بے ایمانی پر جو غصہ آیا تو آپ نے دو نوٹ پیپر سیاہ کر دیئے اس کا ماحصل یہ تھا کہ آپ نے دونوں حصوں کی قیمت کا وی پی کیا مگر پارسل میں ایک ہی حصہ رکھدیا۔ اس بے ایمانی سے نہ آپ امیر ہو جائیں گے نہ ہم غریب" مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ ہم ان کے پلے نہیں باندھے گئے تھے شادی ہونے سے پہلے کا مگر اب تو خاصی ادیبہ ہو گئیں ہیں۔

حافظہ اتنا اچھا ہے کہ اپنی تسمیہ خوانی سے لیکر ابتک کے پورے واقعات (بلا تعین تاریخ و سنہ) یاد ہیں۔ ہم اگر کچھ کہدیں تو کنقش الحجر ہو جاتا ہے مگر وہ لڑائی جھگڑے کی بات ہو تو ورنہ کوئی کام یا فرمایش یاد ہی نہیں رہتی اگر ہم دفتر کو جاتے ہوئے کہتے ہوئے جائیں کہ دیکھو ہمیں شام کو دعوت میں جانا ہے۔ کوئی سفید شیروانی نکال کر گنڈیاں لگا دینا اور کسی رنگین قمیص کے بٹن بھی دیکھ لینا اور ایک دستی (رومال) بھی نکال دینا۔ تو وہ نہایت ہی متانت سے اچھا ضرور کہدینگی مگر ہم دفتر سے آکر چائے پینے کے بعد جب شیروانی اور قمیص مانگیں گے تب کہیں اٹھکر حیسٹ ڈرا کھولیں گی۔ اور اگر پوچھ لیا کہ دوپہر میں کیوں نہیں نکالا تو معصوم صورت بناکر کہدیں گی کہ "بھول گئی تھی" اسی طرح ہمارا ہر کام

بھلا دیا جاتا ہے۔

لاحول ولا ہم کہاں سے کہاں آ پہنچ گئے ہاں تو حضرت بات در اصل یہ ہے کہ

لطیف بود و حکایت دراز تر گفتم

خانگی معاملات اور گھریلو زندگی کے واقعات پبلک نہ ہونے چاہئیں مگر کیا کیا جائے "یہ ٹانگ کھولوں تو لاجوں مروں وہ ٹانگ کھولوں تو لاجوں" لکھوں تو بدنام ہوں، انکی باتیں سنوں، غصہ سہوں سب کچھ کروں اور نہ لکھوں تو شاہد بھیّا کی نظروں میں بددماغ، خشک مزاج وعدہ فراموش اور متکبر ٹھیروں۔ عجیب مصیبت ہے۔ دفتر میں لکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ گھر پر وہ لکھنے نہیں دیتیں۔ مکتبہ میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ضرور گذرتا ہے۔ وہاں لکھنے کا ارادہ کرنا مشکل۔ ادھر ہم نے کچھ لکھنا چاہا ادھر عبدالحق صاحب نے چار چھ کتابیں منگوا کر سامنے رکھدیا ایک پان کا بیڑا بازار کا منگوایا ہوا (کیونکہ انکی محترمہ بھی انہیں پان نہیں بھیجتیں) سرکا دیا اور گال پھلا کر فرمانے لگے۔ تمکین! ذرا ان کتابوں کے اشتہار تو لکھدو! چلو چھٹی ہوئی۔ اشتہار لکھتے لکھتے مغرب کا وقت ہو گیا۔ ہم نے سائکل سنبھالی اور گھر کا راستہ لیا۔ اگر مولوی عبدالوہاب پہنچ گئے تو کاغذ کھینچ کر پھینک دیا اور سخت نامعقول ہو کہکر ایک دو گھونسے رسید کر دیئے۔ یا کرسی لڑھکا دی اور لکھنا ختم۔ اگر وہاب نہ آئیں اور عبدالحق اپنے لین دین میں مصروف ہوں تو میاں حامد نے اپنے خاص اور نگ آبادی

لہجہ میں حاجیوں کو لیکر جدہ جانے والے جہاز کا قصہ بنگالیوں اور بنجاریوں کو گالیاں سناتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ پھر کلکتہ کے قیام کے زمانہ کے تجربات عالیات سے معلومات میں اضافہ فرمانے لگے۔ چلو لکھنا ہوگیا۔ کہئے اب کیا کیا جائے۔

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیدا ست

وہاب کی مقشر ڈاڑھی کی قسم ہے کہ ہم چار مہینے سے "ساقی" کیلئے لائٹ ہیومر لکھنے کے خیال میں رہتے ہیں مگر لکھنا نہیں ہوتا۔ آخر سوچتے سوچتے ہم نے لکھ ہی لیا، آپ پوچھیں گے کس طرح سنئے!

آج کل صبح کے دفاتر ہیں۔ ہم ٹھیک پانچ بجے جاگتے ہیں اور ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتہ کرکے ٹھیک سوا چھ بجے دفتر چلے جاتے ہیں اور پھر ٹھیک ایک بجے دفتر سے گھر آجاتے ہیں۔ "وہ" بھی ہمارے ساتھ جاگتی ہیں اور ہمارے دفتر سے گھر آنے تک کام کاج میں مصروف رہتی ہیں ڈیڑھ بجے کھانا کھا کر دو بجے ہم سو جاتے ہیں اور وہ بھی فنا فی النوم ہو جاتی ہیں۔ اور پھر پانچ بجے جاگتی ہیں ہم بھی روزانہ دن میں پانچ بجے تک سویا کرتے تھے آج اتفاق سے "وہ" سو گئیں مگر ہمیں نیند ہی نہیں آئی ہم نے کہا چلو "ساقی" کے لئے ہی کچھ لکھ لیں اور بیٹھ گئے کاغذ لیکر۔ اسوقت ساڑھے چار بجے ہیں۔ ٹھیک پانچ یا اس سے کچھ پہلے وہ جاگیں گی۔ اس لئے ہم ابھی سے

مضمون ختم کردیتے ہیں ورنہ انہوں نے دیکھ لیا تو آفت آجائے گی۔

پانچ بجے وہ جاگ کر منہ ہاتھ دھو کر پوچھیں گی تو کہدیں گے کہ تم سے دس منٹ پیشتر جاگا ہوں۔ چلو چھٹی ہوئی، ادہر بھیّا شاہد کی خفگی سے ادھر اُن کے غصہ سے۔

یہ ہے ہمارے مضمون نہ لکھنے کی وجہ ورنہ ہم اور مضمون نہ لکھیں، ناممکن، بھیّا شاہد کو اب تو اندازہ ہوجائے گا کہ ہم کس قدر مجبور ہیں اگر ممکن ہوا تو ہم کبھی نہ کبھی اپنی مجبوری کی وجہ سے وہ تصویر بھی "ساقی" میں شایع ہونے کیلئے روانہ کردیں گے جو آئے دن گھر میں ہر ایک کو نظر آتی ہے۔ جب کبھی وہ خفا ہوکر ملتی ہیں ہم اور وہ ملکر بیٹھ جاتے ہیں ننہا آکر گود میں سوار ہوجاتا ہے اور وہ.....

پھر تو یہ منظر رہتا ہے کہ

فوق البشر نشستہ ہے اک شوہر غریب — مصروفِ غور کف میں زنخداں لئے ہوئے
پہلو میں اسکے اک زنِ گلگوں گداز تن — آبِ حیات سینۂ عریاں لئے ہوئے

مصروفِ نوش چشمۂ آبِ بقا پہ ہے
ننہا دہن میں غنچۂ پستاں لئے ہوئے

جھوٹ

اگر مجھ سے پوچھئے تو میں "جھوٹ" کو فنونِ لطیفہ میں جگہ دوں گا۔ اس لئے
نہیں کہ وہ بعض وقت انسان کو بچا لیتی ہے۔ بلکہ محض اسلئے کہ اس کے کہنے اور
اسکو نباہنے کے لئے بھی خاص دماغ داری اور فطری نفاست کی ضرورت ہے،
میں ایسے جھوٹ ہی نہیں سمجھتا جو نبھ نہ سکے، جو ظاہر ہو جائے اور جسے کوئی یقین
نہ کرے جھوٹ وہ ہے جو نہایت ہی ثقاہت، سنجیدگی اور اطمینان کے ساتھ
بلا سوچے سمجھے کہی جائے اور سننے والا اسکو کم از کم واقعہ تصور کرے کہنے والے
کیطرف سے بدگمان ہو نہ بدگمانی کا اندیشہ ہو۔

"جھوٹ" کہنے کی مشق کرنی حماقت ہے، فنون لطیفہ کی طرح دروغ گوئی
کسب سے نہیں آسکتی۔ "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" یہ بالکل فطرتی اور قدرتی
چیز ہے، ہر بچہ ایک تیزی ایک ذہانت ایک چلبلا پن ایک معاملہ فہمی ماں کے
پیٹ سے لیکر پیدا ہوتا ہے، والدین اور عزیز و اقارب دوست احباب ملنے

جلنے والوں کی صحبت میں ان چیزوں پر جلا ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ ہر ایک چیز معراج کمال پر پہونچنے لگتی ہے، بد مذاق والدین بچے سے بے تکی جھوٹ یا دھوکہ آمیز گفتگو کرکے اسے جھوٹا بنا دیتے ہیں۔

یوں تو دنیا میں ہزاروں جھوٹے ملیں گے سینکڑوں جھوٹ آپ خود سن چکے ہونگے اور سینکڑوں دفعہ آپ نے خود جھوٹ کہی ہوگی۔ مگر آپ نے اس پر غور نہیں کیا ہوگا کہ یہ ہے کیا چیز؟

یہ ایک تحفہ ہے جو والدین اپنے عزیز لڑکوں کو دیتے ہیں یہ ایک انعام ہے جو استاد اپنے شاگرد کو دیتا ہے یہ ایک تمغہ ہے جو دوستوں کی طرف سے دیا جاتا ہے یہ ایک امانت ہے جو بیوی سپرد کر دیتی ہے۔

بچہ عموماً ماں کی گود میں جھوٹ بولنا سیکھتا ہے۔ مجھ سے گو میری والدہ نے کبھی کوئی بات جھوٹی نہیں کہی مگر کھلائی اور انّا کی جھوٹ نے مجھ پر خاصا اثر کیا اور مجھ میں جھوٹ بولنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگی، بچپن کے آخری اور جوانی کے ابتدائی ایام میں والدین کی سختیاں بڑھ گئیں اور مجھے مجبوراً جھوٹ کہنی پڑی، مدرسہ کے برخاست ہوتے ہی گھر نہ پہنچنے پر پرسش ہو تو "جھوٹ" شام میں دیر تک باہر رہنے کی وجہ دریافت ہو تو جھوٹ، میوہ خوری یا جیب خرچ کے روپئے جو پہلی کو ملا کرتے تھے، مہینے کے پہلے ہی ہفتہ میں ختم ہو جائیں اور دوبارہ مانگنے پر وجہ دریافت ہو تو "جھوٹ" ان دروغ بافیوں نے

اچھا خاصا جھوٹا بنا دیا۔

محرم کا مہینہ ہے مدرسہ غائب کر کے نھتو بیگ کا رنگ دیکھ رہے ہیں۔ صبح کے گئے واپس ہوتے ہیں تو شام کو وجہ پوچھی تو کہدیا کہ پانچ بجے تک تو مدرسہ میں تھا۔ وہاں سے ذرا مجلس میں چلے گیا تھا اب مجلس سنکر آرہا ہوں چلو چھٹی ہوئی، پانچ بجے چاء پی کر گئے اور رات کے نو بجے تک سینما دیکھتے رہے، واپسی پر پوچھا تو کہدیا۔ ایک ہم جماعت کے والد مر گئے تھے راستہ میں میت نظر آئی تو ساتھ ہو گیا اب دفنا کر سب لوٹے تو میں بھی واپس ہوا۔ چلو بچ گئے، رات کو اگر غائب رہنے کی ضرورت پیش آئی تو پہلے سے یہ کہکر کہ فلاں دوست کے گھر دعوت ہے، نیاز ہوگی رات بھر مولودِ شریف بھی ہوگا۔ چلو اجازت مل گئی رات اپنی۔

جیب خرچ ہیوی خوری کے روپیوں سے خوب سگریٹ پئے مدرسہ غائب کر کے بارہ دری گئے وہاں مٹھائیاں اڑائیں اب جو روپئے ختم ہو گئے تو یہ کہکر مطالبہ کیا کہ ڈکشنری کھو گئی تھی ایک نئی خرید لی ہے کاپیوں کیلئے کاغذ اور ڈرائنگ کیلئے برش اور رنگ کا ڈبہ لیا روپیے نہیں رہے چلئے حساب ہوا اور روپیے مل گئے۔ یہ تھا بچپن کا حال۔

جوانی میں شادی ہونے تک یہی حال رہا۔ میلادِ شریف کے بہانے سے ناٹکیں دیکھیں دوستوں کی شادیوں کے بہانے سے گانے سنے کوٹھے لے چکے،

دنیا بھر کے کام کیئے۔

شادی ہوتے ہی نگرانی اور سخت نگرانی شروع ہوئی، دفتر سے واپسی میں دیر ہوئی تو پرسش، تفریح سے واپسی میں تاخیر ہو تو جواب طلب، رات کو جانے کی اجازت ہی نہیں اور اگر اجازت کے بغیر غائب رہے تو غضب، آفت، قیامت، اسرہانے سے کنجیاں لیکر بیگم صاحبہ نے اٹاچی کیس کھول لیا اس میں سے روپیوں کا بٹوا غائب، اب صبح مانگئے تو پہلے انکار ہوگا۔ آخر مجبوراً اقرار بھی کیا تو روپیے دینے کا نام نہیں۔ مجبور کرنے پر دیا بھی تو صرف ایک روپیہ چلو سستے چھوٹے، بقیہ روپیئے غائب،

ان آفتوں سے بچنے کے لئے جھوٹ نہ کہئے تو کیا کیجئے، یہ تھوڑا ہی کہہ سکتے ہیں کہ رمضان کی ۲۲ تاریخ کو جلسہ ہے گانا ہوگا۔ یہی بہانا کر دیا کہ فلاں دوست کے لڑکے کی روزہ کشائی ہے، چلو رات بھر غائب رہے، اسی طرح جھوٹ کہہ کہہکر دن گذارنے پڑتے ہیں۔

مگر اس جھوٹ کا کمال یہ ہے کہ کسی کو شبہ نہ ہو کہ یہ جھوٹ ہے ایکدفعہ صبح گھر سے نکلے تو ایسے برے پھنسے کہ تین دن تک گھر لوٹ نہ سکے اب جو واپس آتے ہیں تو قیامت مچی ہوئی کہاں رہے، کدھر رہے؟ کیسے رہے؟ ایسے عجیب وقت میں حواس کا باقی رہنا اور اطمینان کے ساتھ جھوٹ کہنا بھی خاص بات ہے ہم نے نہایت ہی بے اعتنائی سے کہدیا، چچا گھوڑ ریسے

گر گئے تھے۔ "کلم" جیسے تعلقہ پر ڈاکٹر کہاں سیّد میاں کے پاس تار آیا وہ مجھے راستہ میں ملے سیدھے ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا اور وہاں سے ساتھ لیکر "کلم" چلے گیا راستہ میں علی میاںؓ مل گئے تو اُن سے ساٹھ (۶۰) روپیہ لئے جو کرایہ میں کام آئے ورنہ گھر تک چلکر کرنی پڑتی تھی۔ شکر ہے کہ چچا کی ہڈی جڑ گئی اچھا ذرا پانی نکلوا دو۔ نہا کر کپڑے بدل دوں گا اچھا وہ ساٹھ روپیے بھی دیدینا علی میاںؓ کو بھیج دیتا ہوں۔ چلئے روپئے بھی ملے خاطر مدارات بھی ہوئی اور حلبہ مفت میں رہا۔



جھٹکا

دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف دہ سواریاں دو ہیں۔ شمالی ہند کا یکّہ اور حیدرآباد کا "جھٹکہ" چاہے وہ ربڑ ٹائر ہوں یا لوہا ٹائر اور اس میں "خچر" جُتا ہویا "یابو" مگر ہیں بدترین سواریاں۔

چاہے "نامپلی اسٹیشن" (براڈ گیج) پر اتریں یا کاچی گوڑہ اسٹیشن (میٹر گیج) پر دونوں جگہ بھی آپ کو ملے گا تو جھٹکا، اس کے موجد نے نام بھی بڑی دوراندیشی سے رکھا ہے، ایسے جھٹکے (دھکّے) لگتے ہیں کہ توبہ بھلی، خدا کا شکر ہے کہ یہ سواری دکن میں سوا حیدرآباد اور مفصلات کے کسی اور جگہ نظر نہیں آتی ورنہ ایک مصیبت تھی۔

برادرانِ دکن تو جھٹکے کے جھٹکوں سے واقف ہیں جن حضرات نے اسکی زیارت نہیں کی ہے وہ کسی رسالے میں (چاہے وہ الہ آباد کا ادب ہو یا حیدرآباد کا دکن ریویو مگر ہو پرانا) چارمینار کی تصویر دیکھ لیں اس میں۔

ایک چھوٹی سی کاٹ کی مزار کسی بابو یا ٹٹو کے سہارے نظر آئیگی۔ وہی جھٹکا ہے۔ آیا خیال شریف میں! یہ بات ابتک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ چار مینار کی پرانی تصویریں معہ جھٹکہ سمیت کیوں لگئی ہیں نہ جانے اس زمانے میں جھٹکا چار مینار بنا ہوا تھا یا چار مینار جھٹکا! خیر!

حیدر آباد میں چوکڑے، موٹر، بگھی، (بہمہ اقسام) رتھ، شکرم، ٹانگہ، رکشا، بنڈی، سبھی کچھ موجود ہیں مگر کثرت ہے تو جھٹکے کی ڈولیاں اور میانے بھی تھے۔ مگر اب ڈولی نظر نہیں آتی۔ میانے صرف شادیوں میں دکھائی دیتے ہیں، رتھیں صرف سرکاری رہ گئی ہیں۔ امراء کے پاس ہی تھیں مگر اب نہیں رہیں، شکرامیں بگھیوں اور موٹروں کی کثرت کی وجہ گھٹتی جارہی ہیں برقعہ گاڑی دکن میں رائج ہی نہیں رہی اورنگ آباد میں کسی زمانے میں نظر آتی تھیں، ابتو وہاں بھی نہیں۔"

موٹروں کی یہ کثرت ہوگئی ہے کہ روشن خیال نوجوانوں سے قطع نظر میانہ نشین بوڑھے بھی اب موٹر پر نظر آتے ہیں۔ ٹکسی کو پوچھئے نہیں جھٹکوں سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں "لاری" اور "بس" بھی ان گنت ہیں مگر پھر بھی جھٹکے کم نہیں ہوتے "فلک نما" سے "سکندر آباد" تک چلے جائیے جھٹکے ہی جھٹکے نظر آئیں گے۔ حیدر آباد کا متوسط طبقہ جسے لوگ مڈل کلاس بھی کہتے ہیں، جھٹکہ نشین ہے، جسے دیکھئے جھٹکے میں لدا ہوا

نظر آئے گا۔

ہماری صفائی بلدہ (بلدیہ) بھی ستم ظریف ہے۔ سال میں ایک دفعہ نمبر اندازی ہوتی ہے۔ جھٹکہ کا ٹیکس لیکر جھٹکہ والوں کو بلّہ چھٹی (پاس) دیا جاتا ہے اور اس زمانہ میں نگرانی کی جاتی ہے ہر جھٹکا دلہن نظر آتا ہے کبھی دفتر صفائی میں چلے جائیے تو یہ دلچسپ تماشا بھی نظر آئے گا۔ اسیسر صاحب میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ انسپکٹر بھی پہلو میں ہے دو ایک پولیس کانسٹبل بھی موجود ہیں۔ ایک ایک جھٹکا آتا ہے، ڈھانچہ گدّیاں یا یوں سازو سامان سبھی چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ ان پر نمبر لگایا جاتا ہے۔ یا یوں دوڑا کر بھی دیکھ لیا جاتا ہے۔ جھٹکہ والے کا خاکی ڈریس بھی ملاحظہ ہوتا ہے اور فیس (ٹیکس) لیکر ایک ٹین کا مربع پلیٹ جس پر "صفائی بلدہ سنہ ۳۴ اف درجہ چہارم نشست چہار اشخاص ۱۰۰۲۲۲۲" لکھا ہوتا ہے اور ایک پیتل کا ٹکڑا جسکے دونوں بازوؤں پر سوراخ ہوتے ہیں اور اس پر بھی یہی عبارت منقوش ہوتی ہے اور ایک "شرح کرایہ کا تختہ" جسکا ترجمہ ہمارے ایک دوست نے کرایہ نامہ کیا ہے دیا جاتا ہے۔ چلو خوشی خوشی جھٹکا چلا۔ اس نمبر اندازی کے زمانے میں جھٹکا والی مخلوق "بڑی بڑی جدّتیں کرتی ہے کوئی تو نہایت مہین ریشم کے پردے ڈال دیتا ہے۔ سازو سامان یا بلدہ جھٹکے کو نہایت شوخ رنگ دیتا ہے گھوڑے کی خوش نصیبی سے اگر سفید ہو تو دُم اسر پاؤں، رنگ کر پنج کلیان بنا دیتا ہے

دروازے پر ویلکم یا خوش آمدید لکھوا دیتا ہے۔ بہرحال اس زمانہ میں جھٹکہ دلچسپ نظر آتا ہے،

مگر ادھر نمبر پڑا اور ادھر آہستہ آہستہ سب چیزیں غائب وہی اونگھتا ہوا گھوڑا اور نیم بے ہوش، جھٹکا والا اور جھٹکا ایسا مخدوش اب گرا کہ گرا اسی میں سواری ہو رہی ہے ؎

علی الصباح چو مردم بکار و بار روند
بلاکشانِ دفاتر بہ روبکار روند

ان غریبوں کو اسی جھٹکہ میں جانا پڑتا ہے دو دو آنے کرایہ کرکے تین اشخاص لد جاتے ہیں اور دفتر پہونچ جاتے ہیں سب سے دلچسپ چیز جھٹکا والا ہوتا ہے انکے کئی اقسام ہوتے ہیں اور اپنی اپنی قسم کے لحاظ سے ان میں دلچسپی ہوتی ہے۔

(۱) نوجوان لڑکے جو چند روز بھیک مانگنے اور کسی ہوٹل میں نوکر رہکر نکالے جانیکے بعد "آوارہ گردی" کی علّت میں چالانِ عدالت ہوکر جھٹکا چلانے والے، یہ عموماً اکھڑ، غصیلے، فطرت کے لحاظ سے لڑاکو اور شریر ہوتے ہیں۔ گراہیہ داروں سے لڑنا گالی گلوج کرنا انکے لئے معمولی بات ہوتی ہے۔

(۲) پہلی قسم کے متوسط عمر والے جو زیادہ دنوں تک جھٹکا چلاکر تجربہ کار ضرور ہو جاتے ہیں مگر پرانی عادتیں انمیں بھی موجود ہوتی ہیں!

(۳) نوکری نہ ملنے کی وجہ یا اپنی سستی یا کاہلی کی وجہ جھٹکا چلا کر گذر بسر کرنیوالے یہ لوگ پہلے اور دوسرے طبقے کے جھٹکے والوں سے زیادہ سنجیدہ اور غنیمت ہوتے ہیں۔

(۴) تجربہ کار جہاندیدہ، معمر با توفی، سزا یافتہ، افیونی، جھٹکے والے یہ بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ آپ کسی چوتھی قسم کے جھٹکے والے کو دیکھکر اسکے جھٹکے میں سوار ہو جائیے اور پھر نہایت آہستگی سے پوچھ لیجئے کہ "ملازم ہو یا ذاتی جھٹکا ہے؟" بس اس نے اپنی ساری کہانی شروع کی، از آں دم تا ایں دم ایک ہی سانس میں ساری کہانی سنا دیگا۔ اور بیچ بیچ میں ایسے ایسے دلچسپ حالات، واقعات اور حکایات بھی سناتا جائے گا کہ آپ حیران ہو جائیں گے۔ موسٰی ندی کی طغیانیاں، طاعون کے دورے سے لیکر انفلوئنزا، ملیریا، قحط، آرائش بلدہ، ہائیکورٹ، سول ہاسپٹل وغیرہ کی تعمیر، ڈیوک آف کناٹ، پرنس آف ویلز، اور چار چھ وائسرائے کی آمد کے جلسے، نمایش، ناٹک، سینما سرکس سے لیکر گنڈی پیٹ اور حمایت ساگر کی تعمیر تک کے دلچسپ حالات سن لیجئے، ہر ایک موضوع پر بلا تکلف گفتگو کرنے والا غیر تعلیم یافتہ اگر کوئی مل سکتا ہے تو وہ جھٹکا والا اور صرف جھٹکا والا ہے۔

خاص خاص لوگوں کے ذاتی حالات عادات و اطوار چال چلن، تمدن و معاشرت کے متعلق کرد ڑہا قصے سن لیجئے اس سے بحث نہیں کہ وہ خواہ مخواہ

صحیح ہی ہوں۔ مگر اس نفاست سے سنائے جائیں گے کہ سننے والا زبردستی یقین کرے گا۔

مجھے عموماً وحشت ستاتی ہے۔ جب شدت کا دورہ ہوتا ہے تو میں کسی قسم چہارم کے جھٹکے والے کو تاک کر جھٹکے میں بیٹھ جاتا ہوں اور اس سے کوئی ایک سوال پوچھ کر بیٹھ رہتا ہوں۔ بس گویا گراما فون کو کوک دیا۔ سنتے جائیے یہاں تک دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے کہ خفقان رخصت ہو جاتا ہے "دیب رونا" شربت کے شیشے ٹنکچر ڈے، جی، ٹینا، کے بڑے بڑے خوراک بھی خفقان کو اس قدر جلد نہیں روک سکتے۔ جتنی تیزی سے کہ ایک جھٹکے والا اپنی دلچسپ اور مزیدار گفتگو سے روک دیتا ہے۔

مئی کے تیسرے ہفتے میں گرمی شدت کی تھی، غالباً جمعہ یا اور کسی تعطیل کا روز تھا۔ مجھے خفقان نے آلیا۔ بارہ بجے سے تین بجے تک تو گھر پر پڑا رہا جب خانہ نشینی خارج از اختیار ہو گئی تو ع

چھڑی ہاتھ میں لیکے گھر سے نکل

چار مینار کی طرف چلا۔ میداں خانکے چوک سے وزیر علیؒ پاشا کی ڈیوڑھی تک بیسوں جھٹکے کھڑے تھے مگر کوئی جھٹکے والا مطلب کا نظر نہ آیا۔ سوکھے حوض کے پاس سحر باطل کی کمان کی طرف چند جھٹکے کھڑے ہوئے نظر آئے، ایک ایک کو دیکھتا ہوا کمان تک جا پہنچا۔ ایک نہایت میلا کچیلا فرسودہ از کار رفتہ

رنگ پریدی، گدیاں پارہ شدہ جھٹکا نظر آیا جس کا یا بو زور زور سے سانس لیکر یہ ضرور ظاہر کر رہا تھا کہ آخری سانس لے رہا ہے مگر نہ تو آنکھیں ہی کھلی ہوئی تھیں اور نہ ہڈیوں پر گوشت ہی تھا۔ ویٹنیری کلاس کے طلباء کے سامنے لیکچر دینے کیلئے اس سے عمدہ ڈھانچہ جسکی ہڈیاں بآسانی گنائی اور دکھائی جاسکتی ہوں اور کوئی نہ مل سکتا تھا۔ لطف یہ کہ اس "کاٹ کی مزار" میں ایک نہایت معمر ہستی مصروف مراقبہ تھی۔ چھوٹا سا قد، خاصا کالا رنگ، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں رگیں ابھری ہوئیں ہڈیوں کے سوا کسی حصہ جسم پر گوشت کا نام نہیں۔ کثرت ریاضت سے کمر جھکی آنکھیں اندر کو دھسی ہوئی گال پچکے ہوئے۔ ٹھوڑی پر گنتی کے چند بال بعض سفید بعض کالے باریک باریک مونچھ کانوں کی لوئیں پلٹی ہوئیں۔ ایک کالے کرتے پر سرخ صافہ (شملہ باندھے جھٹکے کے ایک کونے میں یہ گٹھڑی کچھ اسطرح رکھی ہوئی تھی کہ ع

ڈاڑھی بھی جو ہلتی تھی تو ہوتا تھا گماں اور

پہلے ہمنے جھٹکے کے تختے کو چھڑی سے ٹھونکا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی آوازیں دیں مگر ع

کچھ ایسا سویا تھا سونیوالا کہ جاگنا حشر تک قسم تھا

آخر ہم نے غریب گھوڑے پر چھڑیاں چلانی شروع کیں۔ چار چھ چھڑیوں کے رسید کرنے کے بعد گھوڑے نے ایک جھرجھری لی۔ گردن،

سیدھی کی اور آہستگی سے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ پے در پے چار چھ دھکّے لگنے
کے بعد جھٹکہ والے نے آنکھیں کھولیں۔ بیک نفظ بیس پچیس مغلظات گھوڑیکو
سنادیں اور پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر پوچھا، میاں جھٹکہ لاؤں؟ ہم نے گردن
کے اشارے سے ہاں کہدی۔ بڑے میاں نے سنبھل کر شملہ (صافہ)
ٹھیک کیا۔ جسمیں سے ایک کاڑیوں کی ڈبّی، ایک چار مینارہ سگرٹ کی ڈبی
ایک کٹہ یا دگیری بیڑی کا گدیوں پر گر پڑا۔ شملہ باندھنے کے بعد یہ تینوں چیزیں
پھر شملہ ہی میں ٹھونسی گئیں۔ گدیاں جھٹکیں، چابک ڈھونڈ ڈھانڈہ کر ہاتھ میں
لیا۔ اور دروازہ کھول کر ہماری طرف دیکھنا شروع۔ ہم نے سوار ہو کر دروازہ
کا بولٹ لگا دیا۔ اور بڑے میاں نے پوچھا۔ میاں کدھر چلوں۔ ہم نے پہلے تو
کچھ سوچنا چاہا۔ مگر نہ جانے کیا بات ہوئی کہ یکایک زبان سے نکل گیا "کاروان"
بڑے میاں نے جھٹکا پلٹایا اور گھانسی کے بازار محبوب کی مہندی کا چکّر دیکر
حسینی علم کی سڑک پر پہنچے اور اطمینان سے بیٹھکر گفتگو شروع کی کہنے لگے۔
"میاں! مہندی[1] کے موڑ پر آپ نے تبنیوں (کھڑکیوں؟) والا مکان
دیکھا۔ اس میں باہر والی ایک کسبن (کسبی) آکر ٹھیری ہوئی ہے۔ صورت تو کچھ
اچھی نہیں مگر آنکھیں غضب کی ہیں۔ بڑی صاحب جان کے بعد میں نے
آنکھیں دیکھیں تو بس اسی کی۔ گلا تو بھی اچھا ہے۔ ناچتی بھی ہے مگر کوئی خاص
بات نہیں ہے۔ لوگ اسی پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ آٹھ دس دن سرور نگر میں تھی

[1] زبان کے ذمہ دار ہم نہیں جملہ حقوق بحق جھٹکہ والا محفوظ۔

نواب جعفریار جنگ بہادر نے بلالیا تھا۔ ہزاروں لیکر آئی ہے مگر میاں جاتے وقت جو رونق منہ پر تھی اب نہیں رہی۔ ہزاروں روپے جھپ (مفت) تھوڑا ہی ملتے ہیں آدھی ہو کر آئی ہے۔ یہاں کوئی بھی کسبن اچھی آجائے تو یہی حال ہوتا ہے اجڑے گاؤں میں گدہی سہاگن کا حال ہے شہر میں کسبنیں (کبیاں) ہیں کہاں بتو ایک بھی نہیں پرسوں ہی کی بات ہے کہ چار مینار کے چاروں کونے آباد تھے۔ صبح سے شام تک بنگلوں (کوٹھوں) پر کسبن ہی کسبن نظر آتی تھی۔ مگر ان پولیس والوں نے غریبوں کو نکالا۔ بیگم بازار، سدی عنبر کا بازار، موسیٰ باؤڑی (باؤلی) پر جاکر رہگئیں۔ مگر عماد جنگ بہادر نے وہاں بھی چین لینے نہ دیا وہ وہ تکلیفیں دیں کہ ایک ایک کرکے سب بھاگ گئیں جو بچیں وہ مر کھپ گئیں۔ ہائے میاں! بھارجی کا طائفہ، کالی جان کا گھرانا، صاحب جان کا طائفہ موتی جان کا بنگلہ سب تباہ ہوگئے۔ ظالموں نے ایک کو بھی نہیں چھوڑا اب دو چار کالی پیلیاں سدی عنبر کے بازار میں اور چار چھ گولی گوڑے میں، دو ایک بیلے میں رہگئی ہیں۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا۔ وہ بھی کسی کام کی نہیں رہیں نہ تو گانا آتا ہے اور نہ [illegible]۔ صورت نہ شکل باہر سے آجاتی ہیں تو سال چھ مہینے خوب قدر ہوتی ہے مگر اس کے بعد لوگ ستانے لگتے ہیں اور وہ ٹکنے نہیں پاتیں۔ یہ بی جان جواب آئی ہوئی ہیں چند ہی روز میں ایسی بھاگینگی کہ پلٹ کر نہیں دیکھینگی۔

پہلے زمانہ میں ہر رسم میں شادی ہو چاہے بسم اللہ ہو۔ کسبیوں کا رہنا لازمی تھا۔ براتوں کے ساتھ "تختِ رواں" رہتے تھے، اس پر طائفے کے طائفے ہوتے۔ ورنہ ہاتھیوں پر کسبنیں بٹھادی جاتی تھیں، کیسے کیسے دھوم کی باراتیں نکلتی تھیں۔ آخری شادی دھوم دھام سے بس نواب مظفر جنگ کی ہوئی تھی اس کے بعد سے ابتک کوئی دھوم دھام کی شادی دیکھنے میں نہیں آئی۔

درگاہوں کے جھگڑے بھی موقوف ہوگئے وہاں تو کسبنیں پھٹکنے بھی نہیں پاتیں۔ ہولی دیوالی میں سیٹھ ساہوکاروں کے پاس بھی گانے کا دستور نہیں رہا۔ چار بجلی کے گولے لگائے اور گراما فون لگاکر بیٹھ گئے دیوالی ختم، شادیوں میں بڑی دھوم دھام کی تو ایک قوالی کی چوکی بلوالی بس .....

ناٹک ایسی نکلی کہ ان غریبوں کی آمدنی بیٹھ گئی۔ پہلے جب ناٹک تھی نہ سینما تھے لوگ مغرب کے بعد ٹہلتے ہوئے بنگلوں پر چلے جاتے تھے بیٹھکر گانا سنتے آٹھ نو بجے گھر واپس چلے جاتے!

آجکل لوگ گھر سے نکلتے ہیں تو سیدھا ہوٹل کو جاتے ہیں یا سینما دیکھکر نو بجے گھر کو پہنچ جاتے ہیں وہاں گانا اور ناچ بھی ہوتا ہے۔ بعض سینما والوں نے دو دو تین تین ممولیاں بلالی ہیں، انہیں ناچنا گانا سکھلا دیا ہے۔ بھلا یہ دھیڑنیاں کیا ناچینگی؟ سینما میں انہیں کو نچوا دیتے ہیں لوگ

اسی پر خوش ہیں۔ کہیں مس تارا کا ناچ ہے تو کہیں مس موہنی کا۔ جاکر دیکھو تو غصہ آنے لگتا ہے۔ کاماٹی پورے سے مُرلیوں کو لاکر مس بنا ڈالا۔ لوگ ہیں کہ اسی پہ مٹے ہوئے ہیں۔"

" میاں! آپ لوگ بھی آجکل کے بچے ہیں۔ کسبنوں کو بُرا سمجھتے ہونگے مگر میاں سدا سہاگن لچھمی ہوتی ہیں لچھمی دیکھو نا ادھر چار مینار سے کسبنیں نکالی گئیں اُدھر جھاڑو تارا" (دُمدار ستارا) نکلا، ادھر تارا نکلا، اُدھر مرحوم سرکار نے انتقال کیا۔ اس کے بعد سے طاعون، ہیضہ، ملیریا، انفلوئنزا، مونیا، قحط، اَلا بَلا سبھی آنے لگے سچ کہنا میں جھوٹ تو نہیں کہہ رہا ہوں اب دکانیں بہت زیادہ ہو گئی ہیں۔ لوگ بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔ شہر سجایا جا رہا ہے۔ سیمنٹ کی سڑکیں بن گئی ہیں۔ راستے میں بجلی کی روشنی لگ گئی ہے۔ مگر چار مینار کو دیکھو تو ہُو نظر آتا ہے وہ رونق ہی نہیں جو کسبنوں کے زمانے میں تھی اب کسی بنگلے پر "فقیری چٹکلے" کا تختہ لگا ہوا ہے تو کسی بنگلہ میں "انجمن تجہیز و تکفین" ہے ایک کونے میں کچھ اچھے سے نام کی ایک کفن کی دوکان ہے ایک صاحب نے اس کا "سیدھی سڑک"[۵۷] نام بتایا تھا معلوم نہیں نام کیا ہے مگر وہاں بھی رانذہ، عبیر، کافور، کفن ملتا ہے۔ نیچے کچھ چائے خانے کچھ پھول والوں کی دکانیں ہیں اور کچھ نہیں۔ چار مینار کے کونوں پر عنابل بیٹھے ہوئے نظر

---

۵۷ صراطِ مستقیم۔

آتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رنڈیاں چلی تو گئیں مگر موت کو چھوڑتی گئی ہیں جو چار مینار کی نگہبانی کر رہی ہے۔ اللہ اللہ کیا سے کیا ہو گیا۔"

"قوالوں کے قدرداں بھی نہیں رہے۔ صرف دو ایک چوکیاں رہ گئیں اور باقی سب مر کھپ گئے مراسنوں کا تو خاتمہ ہو گیا۔ اب صرف دو تین طائفے رہ گئے ہیں اور وہ بھی چند روز کے مہمان ہیں۔ جھانگڑنیاں تو اب نظر ہی نہیں آتیں۔ کیا کہوں۔ کیا کیا ہوا ہے۔ شہر میں مرلیوں سے بھی ایک جوبن تھا۔ مگر پولیس والوں نے اسے بھی نہ چھوڑا۔ مرلی بننا ہی سرے سے بند کر دیا۔ پرانی دھرانی جو تھیں وہ مر کھپ گئیں، انکی اولاد مرلی نہ بن سکی، ہائے میاں! کیسی کیسی مرلیاں تھیں۔ مگر اب گھس کر لگانے بھی نہیں ملتیں۔ پر آنے پیر[1] کی قسم رونا آتا ہے ان باتوں کو یاد کر کے......"

"میاں یہ سب بربادی انگریزوں نے پھیلائی۔ انھوں نے مدرسے کھلائے لوگ لگے انگریزی پڑھ پڑھ کر کرسٹان بننے۔ باوا دادا کے طریقوں کو چھوڑ کر انگریز بن گئے۔ بچوں کو انّا کے بدلے ڈبے کا دودھ پلانے لگے۔ کھلائی کے بدلے آیا مقرر کرنے لگے۔ گھر میں مغلانی ہی نظر نہیں آتی۔ درزی کپڑے سی دیتا ہے گھوڑا، گاڑی، پالکی، میانہ سب چھوڑ کر موٹریں رکھ لیں۔ چلو صاحب بن گئے اس سے کتنوں کا پیٹ مارا گیا؟ نیچے والی غریب عورتیں انّاگیری کرتی تھیں

---

[1] غوث اعظم رضی اللہ عنہ ۵۲ کرسچین۔

غریبوں کی بہو بیٹیاں کہلائی پن کی نوکری کرکے زندگی گذار لیتی تھیں سینا پرُونا جاننے والیاں مغلانی کی نوکری کرلیتی تھیں۔ گاڑی گھوڑے پر سائیس کوچوان اور پالکی پر پیادہ اور بھوئی وغیرہ پیٹ پال لیتے تھے مگر اب تو کچھ بھی نہ رہا غریب بھوکے مرنے لگے۔ بیوائیں چکی پیس کر گذران کرلیتی تھیں اگر اب بجلی کی چکیوں[۱] نے ان کے پیٹ پر بھی پاؤں دیدیا۔ بیچاریاں چکیاں چھاتی پر رکھکر بیٹھ رہیں۔ اب فاقے کررہی ہیں۔ خدا حضور کو سلامت رکھے۔ تمام بیواؤں کو تنخواہیں کردیں۔ گذارے مقرر کردیئے جسکی وجہ روٹی کا سہارا ہوگیا۔ ورنہ بیچاریاں کب کی مرگئی ہوتیں ...... آرائش بلدہ کے کام جو ہونے لگے تو غریبوں کو مزدوری مل گئی۔ مٹی ڈھوکر، پتھر پھوڑکر کام کاج کرکے پیٹ تو پال لیتے ہیں ورنہ اسکا بھی سہارا نہ تھا۔"

جھٹکے والے کی مسلسل تقریر نے مجھے کچھ ایسا لطف دیا کہ میں لگا اونگھنے نہ جانے کتنی دیر اونگھتا رہتا۔ یکایک ایک زوردار ہچکولے نے چونکا دیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک چھوٹی سی "آسٹن" موٹر اور جھٹکے میں تصادم واقع ہوگیا ہے خیر یہ گذری کہ موٹر کا اگلا مڈگارڈ جھٹکے کے پہئیے سے ٹکرایا اور کچھ نہیں ہوا۔ موٹر جھٹکے سے چھوٹی تھی اگر کوئی بڑی بھاری کار ہوتی تو "افضل گنج" کے دواخانے کو جانا پڑتا۔ زبردستی جھٹکے والے نے الٹا "شوفر" کو ڈانٹنا شروع کیا

---

[۱] فلور ملز۔

وہ کیسے جا رہا تھا کہ اونگھ رہا تھا تو پینک میں تھا تو نے "سائڈ" چھوڑ دی مگر جھٹکے والے سنتے تھوڑا ہی ہیں۔ وہ وہ صلواتیں سنائیں کہ سننے والوں کے کان بھی پناہ مانگنے لگے۔ بے پناہ انداز میں ایسی ایسی گالیاں دیں کہ کچھ نہ پوچھو۔"

ان جھٹکہ والوں کو سائڈ سے جھٹکا چلانے کی عادت ہی نہیں جب دیکھو غلط چلینگے۔ سب بائیں سے چلیں تو یہ دائیں طرف چلیں گے۔ موٹر پر سب سواریاں آہستہ چلینگی۔ مگر جھٹکا نہایت تیزی کے ساتھ اسی طرح سیدھی سڑک پر سب سواریاں تیز تیز گزر جائینگی مگر جھٹکہ نہایت ہی آہستگی سے۔ "آہستہ خرام بلکہ مخرام" کہتا ہوا گزریگا دنیا بھر کے "بان" فیل بان، شتربان، رتھ بان، ٹمکم بان، گاڑی بان موٹر بان (شوفر یا ڈرائیور) سب خاموشی سے اپنی سواری ہانکینگے مگر جھٹکا والا چپ ہو ہی نہیں سکتا کیسے جائے گا۔ اندر بیٹھی ہوئی سواریوں سے گفتگو کرے گا وہ مخاطب نہ ہوں تو گھوڑے یا گھوڑی کو جو بھی جھٹکے میں جتا ہوا یا جتی ہوئی ہو گالیاں دیگا۔ ننہال کے سات پشت ددھیال کے چودہ پشت اور اسکی مادہ سے لیکر مالک در پرورش کنندہ تک کو سناتا جائے گا۔ اگر جب بھی جی نہ بھرے تو کسی نہ کسی کو ٹکر ضرور دیگا اور پھر اسے گالیاں سناتا رہیگا۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو گائے گا۔

"وہ لیلیٰ تھی کہ جسکو ملگیا مجنوں مقدر سے"

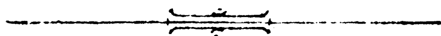
"اب سوگ میں تم کس کھولے ہوے بال آے"

سبھی سُن لیجئے۔ آواز ایسی پاٹ دار کہ سبحان اللہ! "ہدک" پینے والوں میں نہ جانے کیا ہوتا ہے کہ آواز خوب "بن جاتا" ہے انہی حرکات کی وجہ جھبکا والا مشہور ہے۔ حیدرآباد میں یہ حرکات صرف اسی ہستی سے منسوب کیجاتی ہیں جو جھبکا چلاتی ہو۔ اگر کوئی اور شخص بھی ان میں سے کوئی ایسی بات کر گذرے جو خلاف طبع احباب ہو، یا انکی نظروں میں بُری ہو۔ تو اسے فوراً "جھبکا والا" کہدیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے ایک بے تکلف دوست کو تفریح کے وقت لب سڑک گانے پر جو "جھبکا والا" کہا۔ تو وہ ایسے بگڑے کہ ملنا ہی چھوڑ دیا۔

دنیا کی تمام برائیاں تمام خرافات آپ انہیں دیکھ لیجئے چھیڑ کر یہ لڑ نگے راستہ روک کر یہ کھڑے ہونگے، عمداً یہ ٹکر دینگے جان بوجھ کر کہ پیچھے ہی سائیکل تیز آرہی ہے یہ جھبکا روک لینگے۔ ہر شریف آدمی سے کرایہ پر تکرار کرینگے مگر ساتھ ہی ساتھ چوتھی قسم کے جھبکے والے ایسے نظر نہیں آئینگے اور سب باتیں ان میں بھی کچھ کچھ ملینگی۔ مگر ہمدرد، ملنسار کسی قدر خلیق۔ سیدھے سادے بھولے بھالے بھی ہونگے اور ایسے قابل اعتماد کہ آپ ایک دفعہ کی جان پہچان کے بعد قیمتی چیزیں جھبکے میں رکھکر گھر بھجوا دیجئے بکمال امانت گھر پر پہنچا دیں گے۔

مگر یہ کوئی بات نہیں ہر کلیہ کا مستثنیٰ ہوتا ہے بعض جھٹکے والے اچھے
نکل جاتے ہیں اور بعض اچھے لوگ "جھٹکے والے" ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ
موٹروں کی کثرت جھٹکوں کو کم کر رہی ہے۔ آئندہ پچیس سال کے بعد
شاید جھٹکا قدیم تصویروں ہی میں نظر آئے تو آئے ورنہ اسکے باقی رہنے کے
آثار تو نہیں ہیں اچھا بھی ہے۔

خس کم جہاں پاک



گھبراہٹ

زندگی یا تو امیروں ہی کی اچھی ہوتی ہے یا غریبوں کی متوسط طبقہ ہر حال میں بُرا ہر طرح غریب کی مرن ہر حال میں خرابی۔ امراء موٹر نشین ہیں بگھی نشین ہیں یا ہر طرح کی سہولت ہے۔ غربا پیدل ٹاپتے پھرتے ہیں۔ انہیں کوئی عار نہیں کوئی اُن پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ مگر خرابی بیچارے متوسط الحال یا (مفلوک الحال) لوگوں کی ہے۔

سیّد اٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

خیر وہ تو سر سیّد تھے جن کے گزٹ پر لاکھوں مل گئے مگر انہیں کے لوگ (اولادِ معنوی) نیم سرکاری مراسلہ لیکر نکلتے ہیں تو کروڑہا روپیہ ملجاتا ہے اور ہم ہیں کہ پڑے ٹانگیں رگڑ رہے ہیں۔ اور کس نمی پُرسد کہ بھیّا کون ہو؟

دفاتر دورِ اوقات کی پابندی میں سختی۔ غیر حاضری اور دیر حاضری

کا ڈر۔ بایں ہمہ پیدل ٹاپنے کے عوض قرض وام کرکے ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل لے لی تو غضب ہوگیا۔ غلط راستہ (رانگ سائڈ) چلو تو وہیں ایک پولیس کے جواں نے ڈانٹ بتائی اور واپس کردیا۔ قندیل ذرا دیر کیلئے روشن نہو یا ہوا سے بُجھ جائے تو بس دھر لئے گئے یا تو تھانہ میں شب بسری کرکے صبح صدر امین کو توالی کی منت خوشامد کیجیے یا سیکل کو عوض روبرد رکھوا کر ٹھنڈے ٹھنڈے پیدل گھر کو سدھاریئے اور دوسرے روز رحقیت اتفاقی لیکر ایں کچہری اور عدالت کے چکر کاٹئے پھر جرمانہ ادا کرکے رہائی پایئے

چاہے آپ کے کپڑے سفید ہوں یا میلے اچھے ہوں یا بُرے مگر چھڑکاؤ کے موٹر کے گذرنے کے وقت سائیکل سے اتر کر کونے میں دبک رہیے ورنہ نصف آخر یعنے ایڑی سے کمر تک کا حصہ جسم تر بتر نظر آئے گا۔ چھڑکاؤ کی موٹر کا شوفر آپ کو سائیکل سوار سفید کپڑے پہنے ہوئے دیکھکر بکمال لطف مہربانی ذرا آہستہ بھی چلائے گا۔ اور آپکے قریب سے لیجائے گا۔ اور پانی بھی اسوقت خوب اچھلتا نظر آئے گا مختصر یہ کہ آپ بھیگی بلی بنے ہوئے گھر تشریف لیجائیں گے۔

بارش ہو چکی ہو سڑکوں پر کیچڑ ہو اور بعض بعض گڑھے پانی سے بھرے ہوئے ہوں آپ سفید پوشی کے ساتھ سائیکل پر بیٹھے ہوئے ہوں تو ہر موٹر چلانے والا چاہے وہ ذاتی موٹر کا مالک ہو یا کسی کا شوفر یا

ٹکسی کا ڈرائیور کوئی ہو موٹر کو آپ کے قریب سے اور اس قدر قریب سے تیز بلکہ تیز تر اسطرح لیجائے گا کہ آپ سر سے پاؤں تک کیچڑ زدہ نظر آئیں گے نہ صرف ٹوپی بلکہ عینک ناک مونچھ اور شیروانی۔ پائجامہ جوتے تک چھینٹوں سے پُر نظر آئیں گے۔

آوارہ گرد لونڈے، ہشتین۔ ریشائل بوڑھے۔ پچپن سالہ عورتیں یہ سب آپ کو بیچ سڑک پر سے چلتے ہوئے ملیں گے۔ آپ گھنٹی بجائیں چیخیں چلائیں ڈانٹ ڈپٹ کریں مگر کچھ اثر نہ ہوگا۔ وہ یقیناً آپکی سیکل سے ایک اولے کے ساتھ ہم آغوشی کیلئے تیار رہیں گے۔ اگر آپ کی سیکل کے پہیئے نے یا ہانڈل نے ذرا بھی چھوا تو بس غضب ہوگیا۔ چیخ پکار شروع ہوگئی۔ کوئی اس پیدل سے نہ پوچھیگا کہ تو بیچ میں کیوں آیا گھنٹی کی آواز سنکر ہٹا کیوں نہیں۔ بس آپ سے اور صرف آپ سے سوالات ہونگے اور آپ پولیس میں جائینگے۔ اسوقت نہ تو سائڈ پوچھی جائیگی اور نہ گھنٹی کا سوال ہوگا۔

کسی کی سواری آنیوالی ہو تو سب سے پہلے سیکل سوار روکے جائیں گے۔ چاہے وہ آنیوالا بنگال کا گورنر ہو یا مدراس کا میسور کا وزیر اعظم ہو یا ہندوستان کا چرخہ بردار (گاندھی) مگر آپ سب سے پہلے سیکل سے اتارے اور روک لئے جائیں گے۔ موٹر نشین جم جم جائیں گے۔ موٹر سیکل سوار ڈنکے کی چوٹ پھرینگے۔ بگھی نشین بیچ کھیت گزریں گے ایک آدھ پیدل بھی چلے جایگا مگر آپ مھق

اس علت میں اگر سائیکل سوار ہیں روک دیئے جائینگے۔

اگر کسی سڑک پر نالی بنائی جارہی ہو یا آدھی سڑک زیر تعمیر ہو تو ایکطرف لکڑیاں لگا کر آدھا راستہ روک لیا جائیگا۔ سرخ کپڑا بھی بعض وقت لگایا جائیگا ایک دو دفعہ سرخ قندیل بھی نظر آئے گی۔ مگر ایک پولیس کا جوان تقریباً دن بھر میں (۸) گھنٹے ضرور کھڑا ہو راستہ چلنے والوں کو ستائے گا۔ جھٹکہ گذر جائے ہنڈی آجائے۔ موٹر چلی جائے۔ موٹر سیکل گذر جائے بگھی پار ہو جائے۔ پیدل گذرتے رہیں مگر آپ نے قدم رکھنے کا ارادہ کیا کہ اس نے بکمال "اڈوائزیت" ہاتھ بتا کر آپ کو روک دیا اور لگا منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر ڈانٹنے "حضت اتر کر جائیے گڑبڑ زیادہ ہے" چلو چھٹی ہوئی ہاتھ میں سیکل پکڑے ٹاپ رہی ہیں۔

افضل گنج کی مسجد[1] سے سدی عنبر کے بازار کی طرف جانے کا ارادہ ہو تو پہلے چار آنے کے پیسے پنکچر جڑوانے کیلئے جیب میں رکھ لیجئے ادہر آپ نے قدم رکھا ادہر کیلا چبھا ہوا نداردو اب آپ سیکل ہاتھ میں پکڑے ڈھونڈ رہے ہیں دکان سیکل ساز کی۔ لوہاروں کی دکانیں۔ لوہے کے پرانے سامان کی دکانیں دونوں طرف تھیں مگر اب صرف ایک طرف ہیں۔ راستہ کیلوں سے بھرا ہوا ملے گا نہ تو یہاں کبھی جھاڑو ہوتی ہے نہ ہونے کا امکان ہے اور نہ ہو گی

---

[1] اب یہ سڑک درست ہو رہی ہے۔ خدا کرے جلد مکمل ہو۔

اور نہ جھاڑو سے ان کیلوں کا سدباب ہوگا۔ اور نہ تو آپ حفاظت کے ساتھ اس راستہ سے گذرے ہیں نہ گزرینگے۔

ڈرینج کی نالیوں کے کبلئے جا بجا گلیوں میں سڑکوں پر گڑھے کھدے ہوئے ہیں۔ مگر نہ تو کسی جگہ سرخ قندیل ہی نظر آئے گی اور نہ محفوظ باڑھ ہی آپکی سیکل پیدل یا معمولی ڈنہل کی باڑ سے ٹکرائے تو آپ اطمنیان سے گڑھے میں جا رہیں گے۔ آپ کا سر پھوٹے دانت ٹوٹیں ہڈی پسلی گولہ ہو جائے سررشتہ ڈرینج کی جوتی سے اسے تو کام ہے نالیوں کے بنانے سے۔ اجی حضرت انہیں نالیوں پر آپ کی حفظان صحت کا دارومدار ہے جب نالیاں بن جائینگی تو پلیگ آئے گا اور نہ ملیریا اب رہا آپ کا سر پھوٹنا دانت ٹوٹنا یہ سوال ہی فضول ہے۔ میاں دانت اور سر اور ہڈی پسلی جان سے پیاری ہے ٹوٹی ٹوٹی لاحول بھیجو اجی جان بچی لاکھوں پائے!

آذر[1] کے ابتدائی ہفتہ میں کم از کم چار روز کی رخصت اتفاقی لیکر صفائی بلدہ کے دفتر کو جایا کیجئے پہلے روز آپ کو کمیٹی کس خالی ملے گا۔ دوسرے روز اس قدر بھیڑ رہے گی کہ آپ تین گھنٹے انتظار کرکے لوٹ آئیں گے تیسرے روز آپ کو ٹکس کے منشی صاحب ہدایت کردینگے کہ حضرت پرانا پلیٹ لائیے نمبر مکانات بتلائیے۔ سمت حلقہ بھی لکھدیجئے چوتھے روز آپ ہر طرح سے لیس ہوکر جائیں تو صبح نو بجے سے شام کے پانچ بجے تک رہنے کے بعد ایک

[1] سنہ فصلی کا پہلا مہینہ ۱۲

پلیٹ نمبر کا ملے گا۔ اور وہ بھی مفت نہیں ایک روپیہ آٹھ پیسے دینے کے بعد جس کو آپ جھٹکہ کے نمبر کی طرح سیکل کے پیئے میں کاڑیوں سے لگا دینگے چھٹی یعنی رسید موڑ توڑ کر جھٹکے والے کی طرح جیب میں رکھ لیں گے اور گھر جائیں گے کہ کچھ ہو نمبر تو لے لیا اب سال بھر کی بے فکری نمبر اور چھٹی دونوں کے پاس ہوگی۔ صرف آپ میں اور جھٹکہ والے میں ایک "تلے" کا فرق ہوگا،

دفتر میں یا تو اپنے صیغہ میں گاڑی لیجائیے یا باہر رکھ دیجئے کبھی آپ کا قفل چوری جائے گا کبھی قندیل جاتی رہے گی کبھی کوئی نیک بندہ ازراہِ تفریح سوئی چبھو کر پنکچر کر دے گا۔ اگر سیکل عمدہ اور قیمتی ہے تو کوئی نہ کوئی لیکر چلتا بنے گا۔ آپ درخواست دیں گے۔ آپکے افسر اعلیٰ ایک نیم سرکاری کوتوالی بلدہ کو بھی لکھدیں گے۔ مگر فضول نہ تو سیکل واپس ملی ہے نہ ملے گی۔ آپ روئیں گے دھوئیں گے اور خاموش ہو رہینگے۔

یہ ہیں برکتیں سیکل سواری کی اور یہ آفتیں نازل ہوتی ہیں سیکل سوار پر

ہر بلائے کز آسماں آید   گرچہ بر دیگراں قضا باشد
بر زمیں نارسیدہ می پرسد   "کہ یہاں سیکلاں" کجا باشد

اگر اس پر بھی آپ نے سیکل پر سواری کی تو آفریں ہے آپ کی ہمت پر اچھا ہے مزے کیجئے کسی نے کہا ہے نا ع۔ بے حیا باش و بادشاہی کن!

اب ڈکس دیئے جا رہے ہیں جن کی قیمت علیحدہ لیجاتی ہے

خواہ مخواہ

دنیا میں اگر کوئی طبقہ خطرناک اور تکلیف دہ ہے تو یہی ہے ایک شریف آدمی کیلئے اس طبقہ کی موجودگی اسی قدر خطرناک ہے۔ جسقدر نمونیہ کے مریض کیلئے سردی۔ لطف یہ ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں اس طبقہ کے افراد بھرے پڑے ہیں۔ اور ممالک میں کم ہیں مگر اسلامی ممالک میں کثرت سے اور خصوصاً ہندوستان انھیں سے بھرا پڑا ہے۔

چاہے آپ ریل میں سفر کر رہے ہوں۔ یا راستہ سے پیدل گذر رہے ہوں۔ دفتر میں بیٹھے ہوں یا کسی رسٹوران میں چائے پی رہے ہوں۔ یا دیوانخانے میں بیٹھے لکھ رہے ہوں۔ کسی وحشتناک اور خاموش سڑک پر چل رہے ہوں۔ کوئی نہ کوئی خواہ مخواہ ضرور مل جائے گا۔ ریلوے سفر میں بدنصیبی سے تھرڈ کلاس کی آفت نازل ہو جائے تو سارا ڈبہ آپکو خواہ مخواہوں سے بھرا ملیگا۔ ایک آپ کا نام پوچھے گا۔ ایک مقصدِ سفر دریافت کرے گا۔

ایک آپکے واٹر باٹل میں سے پانی نکال کر پینے لگے گا۔ ایک بلا تکلف پان اور سگریٹ مانگ لیگا۔ اگر کہیں آپ نے اس بے تکلفی کو بڑھنے دیا اور پھر ہونے لگی ناشتے یا کھانا کھانے کی تیاری اور تکمیل ضابطہ (مفت کرم داشتن) کیلئے آپ نے انہیں دعوت دیدی تو پھر یہ ٹوٹ پڑے چاہے آپکے پاس بڑا ٹفن باسکٹ ہو یا الومنیم کا توشہ دان، بہرحال سبھی خالی ——
اور آپ مقام مقصود پر بھوکے پہنچیں گے۔

بدنصیبی سے ہمیں ہمیشہ بلکہ روزانہ دو چار خواہ مخواہ مل جاتے ہیں لاکھ جتن کئے ہزار احتیاط کیا مگر کچھ نہ ہوا تھرڈ کلاس میں سفر کرنا ہم نے اسی وجہ سے چھوڑ دیا کہ ہمارا توشہ ان لوگوں کی نذر ہو جاتا تھا، ہاتھ میں اخبار یا کتاب ہو تو چھن جاتی تھی۔ پانوں کی ڈبیہ اور سگریٹ کا ڈبہ خالی ہو جاتا تھا اور سب پر طرہ یہ کہ دماغی اور روحانی کوفت اس قدر رکہ ہم دو چار روز کیلئے مضمون لکھنے کے قابل نہیں رہتے تھے۔

ایک دفعہ ہم حیدرآباد سے عثمان آباد جارہے تھے کہ ایک "خواہ مخواہ" نے بیگم پیٹ اسٹیشن سے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تو واڑی جنکشن تک چین تک لینے نہیں دیا۔ واڑی پر ہم نے ٹکٹ بدل لیا اور سکنڈ کلاس میں جا کر بیٹھ رہے۔ تب کہیں اطمینان نصیب ہوا۔ اگر تھرڈ کلاس میں دوست احباب کے ساتھ سفر کیا جائے اور پانچ سات آدمی ایک جگہ بیٹھکر

ہنسنے کھیلنے لگیں تو ان لوگوں سے چھٹکارا ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

بعض دفعہ سیکنڈ کلاس بھی انہیں حضرات سے بھرا ہوا نظر آتا ہے ایک زمانہ میں ہم پونہ میں تھے اور مقامی لباس کے استعمال کا شوق تھا۔ چنانچہ جب ہم نے پونہ کو خیرباد کہا اور حیدرآباد کا قصد کیا تو اسی مرہٹہ لباس میں اسٹیشن پہنچ گئے۔ بعض ہندو احباب بھی ہمیں خدا حافظ کہنے کیلئے اسٹیشن پر آگئے تھے۔ رات کا وقت اور گرمی کا موسم تھا ہم نے سکنڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا اور سوار ہو گئے۔ احباب نے خدا حافظ کہا ٹرین چلنے لگی۔ ایک الفربہ خواہ مخواہ مرد مسلمان بیٹھے ہوئے ہمیں دیکھ رہے تھے ٹرین کے چلنے کے بعد ہمنے ایک سیٹ پر بیٹھکر اپنا بستر کھولنا چاہا تھا کہ آپ مخاطب ہو گئے فرمانے لگے۔ کہاں جائینگے راجہ! ہم نے کہا "جناب ہم مفلس ہندوستان کے ایک قلاش مزدور ہیں راجہ نہیں" فرمایا "نہیں مہاراج ہم نے تعظیماً آپکو راجہ کہا تھا" ہم نے کہا "حضور اب تو آپ نے راجہ سے مہاراجہ کر دیا۔ بھلا ہندوستانی غلاموں کیلئے یہ طریقہ تخاطب کچھ ٹھیک ہے" فرمانے لگے۔ راؤ صاحب" ہم نے بات کاٹ کر کہا "جناب راؤ صاحب کا خطاب ہمیں ابتک نہیں ملا اور نہ مل سکتا ہے" بات بڑھنے لگی دو ڈھائی گھنٹے اسی ردو قدح میں گذر رہے۔ بالآخر مولوی صاحب تھک کر سو رہے ہمنے بھی اپنا بستر جما لیا۔ صبح آنکھ کھلی تو مولوی صاحب میٹھی نیند سو رہے تھے

ہم نے لباس بدل لیا اور جانماز بچھا کر فریضۂ فجر ادا کرنا شروع کیا۔ چونکہ بدنصیبی سے ہم نے ایک مولوی کے گھر میں جنم لیا ہے اور بچپن سے خاندان بھر کو نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی لئے ہمیں بھی نماز کی عادت ہو گئی ہے اور ہم بالجہر اقامۃ کہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ شاید ہماری اقامت گوئی پر مولوی جی جاگ پڑے اور لگے حیرت و استعجاب سے دیکھنے جب ہم نے نماز ختم کی اور سگرٹ جلا کر پینا شروع کیا تو آپ نے دریافت فرمایا کیا آپ نومسلم ہیں۔ کہئے ہم کیا جواب دیتے۔ عرض کیا ہمارے سات کیا بلکہ چودہ پشت میں بھی کسی نے اسلام قبول نہیں کیا۔ صرف ہمارے جداعلیٰ حضرت علی علیہ السلام نے البتہ نومسلم ہونے کا امتیاز حاصل کیا تہا۔ ان کے بعد سے ہر بیٹا اپنے باپ کے مذہب پر قائم ہے کسی نے دوسرا مذہب قبول نہیں کیا۔ فرمانے لگے ماشاءاللہ آپ سید ہیں۔ اس کے بعد سے مولوی صاحب نے بس ہمیں صیغۂ استفسار بنا ڈالا۔ آپ کا نام، آپ کے والد کا نام، آپ کا وطن، پیشہ، عمر، لیاقت خاندان سکونت سبھی کچھ پوچھ لیا۔ ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ کرڈو واڑی پر ڈبہ بدل لیا جائے ورنہ حیدر آباد پہنچنے تک حضرت چین نہ لینے دیتے، ایسے حادثے ہم پر ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں گذر چکے ہیں۔ صبح کے دفاتر میں گھر سے نکلنے میں دیری ہو گئی ہے۔ آپ نہایت تیزی سے بھاگ رہے ہیں کہ دیر حاضری نہ ہو جائے۔ مگر راستہ میں ایک نہ ایک خواہ مخواہ ضرور مل جائیگا

پھر کیا ہے! سلام علیکم، مزاج شریف، مولنا ذرا توقف فرمائے۔ ارے آپ اتنی صبح جلدی جلدی کہاں جا رہے ہیں۔ خیر تو ہے۔ اچھا تو گویا صبح کے دفاتر ہیں۔ آپ سے تو اب ملاقات ہی نہیں ہوتی پہلے تو کبھی کبھار مل بھی لیتے تھے۔ اچھا یہ تو فرمائیے کہ سبع معلقہ کا سب سے اچھا ترجمہ کس نے کیا ہے مجھے شدید ضرورت ہے کہاں سے ملے گا۔ آپ کے پاس کوئی نسخہ ہے کیا؟ انہی باتوں میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ آپ ان سے پیچھا چھڑا کر دفتر پہنچے ہیں تو آدھ گھنٹہ لیٹ!

چاہے آپ بغیر ناشتہ کئے دفتر گئے ہوں۔ اور دوپہر میں بھی کچھ کھایا نہ ہو۔ چار بجتے ہی بکمال گرسنگی گھر کی طرف دوڑے جا رہے ہوں۔ اس سے بحث نہیں کہ آپ کا چہرہ اترا ہوا ہے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں پریشان جا رہے ہیں۔ خواہ مخواہ روک ہی تو لے گا۔ ارے بھائی ہاں تمکین صاحب کدھر یار۔ ایک میوزک کلب نامپلی میں قائم ہوا ہے۔ ہر جمعرات کو اہل فن جمع ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے کمال کا اظہار کرتا ہے اب کی جمعرات کو تم بھی آجاؤ اس کے ممبر بن جاؤ۔ خوب دلگی رہے گی۔ مولوی عبدالوہاب بھی آتے ہیں۔ ہمیشہ تمہاری تعریف کرتے ہیں۔ بھئی وہ بھی خوب آدمی ہیں۔ گانے کا مذاق بھی اچھا ہے۔ یہاں بھوک سے جان نکل رہی ہے۔ اور خواہ مخواہ ہیں کہ گمانے میں محو ہیں کہ ان لوگوں سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے

چاہے آپ کسی سے ملنے کیلئے وقت مقرر کر چکے ہوں اور پندرہ منٹ پہلے گھر سے نکل رہے ہوں۔ کپڑے پہنے ہوئے دیوانخانے کے دروازے میں ہی کیوں نہ ہوں۔ کوئی خواہ مخواہ گھیرے گا۔ ایں آپ کہیں جا رہے ہیں کیا واہ آپ آمدیتم برخاست یہ بھی کوئی بات ہے۔ طاقت مہماں نہ داشت خانہ بہ مہماں گذاشت، یار بیٹھو تو سہی اب تو تم ملتے ہی نہیں۔ پرسوں حمایت ساگر چلنے کا خیال ہے تم بھی چلونا! دو تین دن رہ کر آجائیں گے ہم نے سگار کا انتظام کیا ہے۔ لاکھ کہیے کہ حضرت ہمیں کام ہے۔ ایک جگہ جانا ہے چائے کی دعوت ہے اور لوگ منتظر ہونگے مگر کون سنتا ہے انتہا یہ کہ وہ اتنی دیر بک بک کریں گے کہ آپ کا وقت گذر جائے گا اور لوگ آپ کا انتظار کر کر کے چائے پی لیں گے۔ دوسرے روز آپ کو جا کر معافی مانگنی پڑے گی آپ دنیا کے جھگڑوں سے اکتا کر تنہا وقت گزارنے کیلئے سنیما چلے جائے۔ وہاں بھی کوئی ایک ملاقاتی بیسیوں دوست ملجائیں گے سب سے پیچھا چھڑا اگر کسی کونے میں بیٹھ جائیے برابر والی سیٹ سے کوئی نہ کوئی ضرور مخاطب ہو جائے گا۔ افوہ بڑا لمبا کھیل ہے یا لارالی پلانٹ بھی غضب کی تی ہی۔ یا آپ نے بہت ہر ملاخطہ کیا تھا، کہہ کر آپ سے کوئی نہ کوئی جواب سن لیگا ایکدفعہ آپ نے جواب دیا اور اس نے بے تکان سلسلۂ گفتگو جاری کر دیا پھر خیر نہیں۔ یا تو سیٹ بدل ڈالئے یا درجہ بدل دیجئے۔ ورنہ ٹھنڈے

ٹھنڈے تشریف لیجائیے۔

یہ خواہ مخواہ بعض دفعہ آرام دہ بھی ثابت ہوتے ہیں چنانچہ ہمیں بعض بعض خواہ مخواہوں سے بڑا آرام ملا اور فائدہ پہنچا ایک دفعہ سفر میں ایک خواہ مخواہ نے دو گھنٹہ تک مختلف سوال کر کر کے دماغ خراب کر دیا۔ مگر جب ہم منزل مقصود پر پہنچے تو انہوں نے نہ صرف ہمیں اس جگہ کے متعلق ضروری معلومات ہی بہم پہنچائے بلکہ پندرہ روز تک اپنے گھر پر مہمان رکھا۔ روزانہ ناٹک اور سینما دکھانے کے علاوہ اپنے نوجوان صاحبزادے کو ہماری رہبری کیلئے وقف کر دیا۔ چنانچہ اُن خواہ مخواہ اور اُن کے لڑکے کی وجہ ہم نے اس جگہ کے تمدنی اور معاشی حالات اس قدر معلوم کر لئے کہ اگر کسی دوسری جگہ دو سال بھی قیام کرتے تو لسکے عشر عشیر معلومات ہی حاصل نہ ہوتے وہیں ایک نوجوان ہندو خاتون نے خواہ مخواہ ہم کو ایک ہندو مدرسہ کا معائنہ کرانے کے علاوہ ۴-۵ مرتبہ چائے پر دعوت دیدی اور دل میں بین الاقوامی شادی کی ہوس بھی پیدا کر دی مگر خدا بھلا کرے ان خواہ مخواہ بزرگوار کا انہوں نے اپنے بعض تلخ تجربے نا کر ہمیں باز رکھا۔ ورنہ معلوم نہیں ہمارے سر پر کتنے چرخے ٹوٹتے اور کتنی گاندھی ٹوپیاں خون میں تر بتر ہوتیں۔ ولے بخیر گذشت۔

•

ایک دفعہ کسی مذہبی معاملہ پر بحث کرتے ہوئے والد مرحوم نے ہمیں

خوب ڈانٹ ڈپٹ کی وہ نرے مولویانہ خیالات کے پکے سنّی المذہب بزرگ تھے اور ہم مذہب سے بہت دور مائل بہ دہریت اسلئے ان سے مذہبی حد تک ہمیشہ اختلاف رہتا تھا۔ تعلقہ تلجاپور پر وہ تحصیلدار تھے ہم بھی انکے ساتھ ہی تھے۔ تلجاپور میں تلجابھوانی کا مشہور مندر ہے۔ وہاں دیول پر کروڑوں جاتریوں کا مجمع ہوتا تھا اور "کھنڈ اشنان" قابل دید تھا۔ چھوٹے سے حوض میں جس کا پانی متعفن ہو چکا تھا حسینان جہاں غوطے لگا کر آبرو بڑھاتی تھیں۔ ہمارا شغلہ ہی یہ تھا کہ اشنان کا نظارہ کیا کرتے تھے ایکدفعہ ہم نے والد مرحوم کو بھی دعوت نظارہ دی۔ حضرت نے کھنڈ اشنان دیکھا اور خوب دیکھا۔ جاترا کے دن تھے۔ دور دور سے آئی ہوئیں غارت گران صبر و ہوش و نازنینان تقویٰ شکن ہلکی سی ململ کی دھوتی سے حصہ اسفل و اعلیٰ کو چھپائے شرماتے لجاتے سکراتے ہوئے آ آکر اشنان کرتیں اور بھیگے ہوئے بالوں سے دُرِ خوش آب ٹپکاتے ہوئے ایک باریک سی اوڑھنی کو تمام جسم سے لپیٹ کر جب نکلتیں تو یہ معلوم بھی نہ ہوتا تھا کہ کوئی کپڑا جسم کو چھپائے ہوئے ہے یا نہیں۔ حضرت نے اس تماشے کو دیکھا اور خوب دیکھا۔ دن بھر اس پر کوئی رائے کا اظہار نہیں فرمایا رات کو کھانے پر آپ نے منجملہ اور برائیوں کے ہندوؤں کی یہ برائی بھی گنائی کہ اس بے حیائی اور بے باکی سے تقریبًا برہنہ ہو کر اشنان کرتی ہیں اور خواہ مخواہ لوگوں کو

مائل بہ شہوت کرتی ہیں۔ ہم نے صرف قبلہ کے چھیڑنے کیلئے کہا پیرو مرشد
سنا ہے کہ جنّوں (جنّاتنیوں) کی حالت بھی تو یہی ہوتی ہے۔ ایک ہی
کپڑا لپیٹے وہ بھی یوں ہی غارت کرتی پھرتی ہیں۔ بس غضب ہو گیا بڑے
میاں نے کھانا چھوڑ کر گالیاں دینی شروع کیں اور رات کے بارہ بجے تک
گالیاں سناتے رہے ہم نے اس ناگوار سلسلۂ گالی گلوج کو ختم کرنے کے لئے
یہی مناسب سمجھا کہ چند روز کیلئے اِن کے سامنے سے ہٹ جائیں۔ چنانچہ
دوسرے ہی روز شولاپور پہنچ گئے اور وہاں سے عادل شاہیوں کے اجڑے
ہوئے پایہ تخت بیجاپور جا ٹھہرے۔ ڈاک بنگلہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے
جو شمالی ہند کے متوطن اور امبا بائی (تلجا بھوانی) کے درشن کو آئے تھے
اور درشن سے فارغ ہو کر بیجاپور دیکھنے آ گئے تھے چونکہ ان لوگوں نے
ہم کو تلجا ماتا کے مندر میں بے تکلفی سے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے دیکھ لیا تھا
اس لئے بیجاپور میں بلا کسی تعارف کے ہم سے گفتگو شروع کر دی اور خواہ مخواہ
دوستی ہو گئی ایک خاتون نے جو آثارِ قدیمہ سے بھی کسی قدر دلچسپی رکھتی تھیں
ایک چھوٹے بھائی اور ایک بوڑھی خادمہ کو ساتھ لیکر سفر کر رہی تھیں۔ ہمیں
اپنا گائڈ بنانے کی خواہش کی ہم نے بھی کمال ہمدردی اس سعادت کیلئے
آمادگی ظاہر کی اور دوسرے روز سے تاریخی مقامات کا معائنہ شروع ہوا
گول گنبد یا بولی گنبد سے لیکر مہتر محل اور ملک میدان توپ تک کا معائنہ

ہم نے کرا دیا۔ تصویریں لیں۔ اسٹال سے خریدی ہوئی گائڈ کے اندراجات کی غلطیاں نکالیں۔ اس کی صحت کی اور بیجاپور سے گلبرگہ کا رخ کیا اس زمانہ میں ہمارے وہ ایک عزیز گلبرگہ میں ضرور تھے مگر ہم لوگوں نے ڈاک بنگلہ ہی میں قیام کیا۔ اور دو روز تک قلعہ ہفت گنبد رکن الدین تولہ اور تالاب بھوسگا دیکھکر ہم لوگ حیدرآباد پہنچ گئے یہاں کی مصروفیتیں اتنی عجیب رہیں کہ

آپ سنئے گا تو شرمائیے گا

بہرحال ہم نے خواہ مخواہ بن کر دو ڈھائی مہینے ان کے ساتھ بسر کئے اور پھر انہیں گھر تک پہنچا کر اطمینان کا سانس لیا۔ اب بھی دعا ہے کہ کوئی ایسا خواہ مخواہ مل جائے۔

ہمارے دفتر میں ایک صاحب بڑے خواہ مخواہ واقع ہوئے ہیں جہاں دو آدمیوں نے گفتگو شروع کی کہ آپ جا پہنچے اور دخل در معقولات شروع کیا۔ چاہے آپ اپنی گھر والیوں کے متعلق گفتگو کر رہے ہوں یا کسی علمی ادبی مباحثے میں مصروف ہوں یا کسی چھوٹی قومی میچ پر خیال آرائی کر رہے ہوں۔ وہ برابر آپ کی گفتگو میں حصہ لیتے رہینگے۔ جدید خیالات کی انہیں ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ نئی دنیا سے وہ بالکل بے خبر ہیں پچپن سالہ عمر کو پہنچ چکے ہیں مگر "خواہ مخواہیت" کو کیا کریں گے۔ ہم نے ان کا نام

خُدائی فوجدار" رکھا ہے۔ وہ سنکر کبھی بگڑتے اور کبھی خوش ہوتے ہیں مگر "العادة طبیعة الثانیة" کریں گے کیا مجبور ہیں۔

ہم نے بعض ایسے خواہ مخواہ بھی دیکھے ہیں جو غیور، خود دار، تنک مزاج سبھی کچھ ہوتے ہیں اور اپنی "خواہ مخواہیوں" کی وجہ سے بے طرح ذلت اٹھاتے ہیں۔ کئی کئی روز اسی کوفت میں رہتے ہیں مگر خواہ مخواہی نہیں چھوڑتے۔ ایک ہمارے دوست جو پولیس کے سرکل انسپکٹر ہیں ایکدفعہ اپنے مہتمم پولیس کے بنگلہ پر پہنچے۔ دورے سے واپس آئے تھے۔ مہتمم صاحب کا مزاج پوچھا۔ زنانہ سے ملازم لڑکا پان لایا۔ تو آپ نے اُسے روک کر فرمایا دیکھنا بیگم صاحبہ کو میری طرف سے آداب تسلیمات کہنا اور مزاج پوچھنا مہتمم صاحب تھے قدیم وضع کے بزرگ، انہیں اتنا غصہ آیا کہ چہرہ سُرخ ہوگیا۔ بگڑ کر فرمانے لگے۔ سرکل صاحب! آپ سے مجھ سے دفتری تعلقات ہیں۔ میری بیوی سے آپ کا کیا تعلق؟ آپ اسے سلام کہلوانے والے کون؟ آئندہ ــــ میرے مکان کی حد تک آپ ایسی حرکت نہ کیجئے ورنہ آپ کو نقصان ہوگا۔ غریب سرکل انسپکٹر کانپ اٹھا دو روز تک اسی کوفت میں رہا۔ مدت تک کسی کے گھر کی مزاج پرسی نہیں کی مگر آخر عادت تھی، چھوٹتی تھوڑا ہی، آہستہ آہستہ پھر عافیت پوچھنے لگے۔

ان لوگوں سے بڑی تکلیف ہوتی ہے جو صورت دیکھتے ہی مخاطب

ہو جاتے ہیں اور خاندان بھر کے حالات پوچھنے کے علاوہ بعض ایسی خانگی چیزیں پوچھنے لگتے ہیں جو ظاہر نہیں کیجا سکتیں اور ایسے سوالات کرکے خود ہی پریشان ہوتے ہیں۔

تہذیب جدید نے اسکو بری نگاہوں سے دیکھا ہے تہذیب قدیم بھی اسے جائز نہیں رکھتی۔ مگر بوڑھوں کو کیا کیا جائے اسے اچھا سمجھتے ہیں۔ ہمیں ایک دوست کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ بدقسمتی سے ان کے جد بزرگوار تشریف رکھتے تھے ہمارے دوست نے ان سے ہمارا تعارف کرا دیا۔ بس غضب ہو گیا آپ کے والد کا نام کیا کرتے تھے آپ کے دادا کا نام، کس خاندان سے ہیں مکان کہاں ہے پیدا کہاں ہوئے تعلیم کہاں پائی نوکر کہاں ہیں۔ شادی ہو چکی۔ کب ہوئی کس سے ہوئی۔ بچے ہیں کتنے ہیں۔ پیدا ہی نہیں ہوئے یا ہو کر جاتے رہے (مر گئے) ڈاکٹر راما نندجی کا پرچہ سوالات متعلق امراض مردمان و زناں تقریباً ایسے ہی سو سوا سو سوالات پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو بڑے میاں نے ہم سے فرمائے کہئے اسوقت ہم کیا کرتے۔ اگر صحیح صحیح جواب دیں تو سوالات میں اور وسعت پیدا ہو۔ اگر جواب نہ دیں تو بڑے میاں بگڑیں کہ کیسا بد تہذیب ہے فقط

شادی سے پہلے

بچپن میں ہمیں شادی کی بڑی خواہش تھی اور یہ خواہش ہر چھوٹے لڑکے کو ہوتی ہے۔ کسی معصوم سے پوچھئے کہ "میاں شادی کرو گے" ؟ تو وہ جواب دیگا "کنوں گا" "کس سے" تو کہدے گا "دادی سے" چلو چھٹی ہوئی جہاں تک ہمیں یاد ہے ہم نے کبھی ایسی خواہش تو نہیں کی البتہ ایک عزیز لڑکی جو رشتے میں ہماری بہن تھی اور ہم سے دو ایک سال بڑی بھی تھی ہمارے پیش نظر ضرور تھی۔ جہاں کسی نے پوچھا کہ میاں شادی کرو گے تو ہم نے کہدیا کہ ہاں کریں گے۔ پوچھا کس سے تو کہدیا "بی بی" سے (یہ لڑکی کا نام تھا) بچپن کی آخری منزلیں طے ہونے تک ہم یہی چاہتے رہے کہ ہماری شادی بی بی سے کر دیجائے، خیر، جوانی کی ابتدائی سیڑھیاں ہم نے طے کرنی شروع کی تھیں کہ بی بی کی شادی ہو گئی ہمیں اس سے سخت رنج ہوا۔ دولہا کو ہم نے طرح طرح کی

اذیتیں دیں مختلف پہلوؤں سے ستایا۔ چنانچہ "چوتھی" کے روز ایسی
خبر لی کہ دولہا میاں کا منہ کئی جگہ سے زخمی ہو گیا۔ خون بہنے لگا۔ وہ سمجھتے
رہے کہ "سالا" مذاق کر رہا ہے اور ہم نے سوچا کہ بدلہ یوں ہی لینا چاہیئے
خیر یہ دن بھی گذر گئے چند ہی مہینوں کے بعد ہم نے یہ واقعہ بھلا دیا
والدین نے عزیزوں ہی میں ایک جگہ بات پکی کر لی تھی ہم نے
تعلیم ختم کر کے ملازمت کر لی تو والدہ ماجدہ جنت کو سدھار چکی تھیں
والد موجود تھے۔ اور صرف دو چھوٹے چھوٹے بھائی، والد نے اُن
لوگوں سے جہاں بات (جو صرف منہ زبانی حد تک) ہوئی تھی گفتگو
کی۔

لڑکی کے والد گزیٹڈ آفیسر تھے ایک معزز عہدے پر مامور اور خاصے
متمول اور ذی رسوخ تھے، انہوں نے اپنی بیوی سے مشورہ کرنا
شروع کیا کہ کیا کیا جائے حسب ذیل سوالات پیش نظر تھے۔

(۱) صرف پچھتر ماہوار ملتے ہیں۔

(۲) والد کی ماہوار منصب وغیرہ کافی ہے مگر کب تک؟

(۳) لڑکا غصیل، ضدی، ہٹ دھرم، جھگڑالو، کاہل الوجود، عیش
پسند، شوقین ہے اسلئے نہ تو آئندہ ترقی کرنے کی امید ہے اور نہ موجودہ
آمدنی ہی اس کے اخراجات کو کفایت کرتی ہے!

(۴) لڑکے میں منجملہ اور چھوٹے چھوٹے نقائص کے ایک بڑا نقص یہ ہے کہ "سگریٹ کثرت سے پیتا ہے۔ ملحدانہ خیالات ہیں۔ نماز روزے کا پابند نہیں۔ بڑوں کا ادب چھوٹوں کا لحاظ نہیں کرتا۔ کپڑے لتّے جوتا ٹوپی پر تنخواہ صرف کر دیتا ہے۔ گانے کا شوق ہے اور ہمیشہ رنڈیوں کا گانا سنتا ہے ممکن ہے کہ پیتا کھاتا بھی ہو۔"

(۵) راتوں کو گھر سے غائب رہتا ہے، لوگوں سے لڑتا جھگڑتا، احباب کی صحبتوں میں زیادہ وقت گزارتا ہے!

لہٰذا

"لڑکی کو روپئے پیسے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی تکلیف ہوگی اور ان عادات کی وجہ سے لڑکی خوش نہیں رہ سکیگی"

پس

کسیطرح اس گفتگو کو ختم کرنا چاہئے اگر صاف انکار کر دیں تو آپس میں کشیدگی اور شکر رنجی ہوگی عزیزداری میں ایسا ہونا اچھا نہیں۔ ابھی یہ لوگ غور ہی کر رہے تھے کہ ہمیں انکے خیالات کا علم ہوگیا اور ہم نے والد ماجد کو سارا قصہ سنا دیا اور یہ بھی عرض کیا کہ ہمیں اس جگہ شادی پسند نہیں براہ کرم آپ اُن سے ملکر فرما دیجئے کہ لڑکا ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا اور شاید کوئی خاص لڑکی اس کے پیش نظر ہے اسلئے آپ اس فکر کو

دور فرما دیجئے اور لڑکی کی "نسبت" کسی اور جگہ کر دیجئے۔ والد قبلہ نے یہ دیکھکر کہ اگر میں ایسا نہ کہوں تو وہ لوگ صاف جواب دیدینگے جس سے خواہ مخواہ ملال ہوگا۔ اس لئے خود انہوں نے ہمارے مشورہ پر عمل کیا اور یہ جھگڑا اٹھا، اس سے ہمیں خاصی کوفت ہوئی اور ایسا ہونا فطری تھا کرتے کیا، صرف یہ کیا کہ شادی نکرنیکا عہد کر لیا، ڈیڑھ سال کے بعد والد نے ہمارے ننہالی عزیزوں میں سلسلہ جنبانی شروع کی خالہ اور خالو نے بھی انکا ساتھ دیا۔ بدنصیبی سے یہ لڑکی ہماری رشتے کی بہن تھی۔ ہمارے بغیر علم و اطلاع ان حضرات نے گفتگو شروع کی۔ لڑکی کے والد انتقال کر چکے تھے۔ والدہ باقی تھیں جو تھیں ذری ہوشیار، جب ان لوگوں نے اُن سے شادی کے متعلق گفتگو کی تو وہ راضی ہوگئیں مگر اقراری جواب بھی دینا پسند نہیں کیا ادھر انہیں کہدیا کہ ذرا سوچ کر جواب دینگے ادھر ہمیں کہلوا دیا کہ ایسا ہو رہا ہے۔ تم شادی کیلئے آمادہ ہو یا نہیں ہم تو تُلے بیٹھے تھے شادی نہ کرنے پر جلدی سے انہیں لکھ بھیجا کہ ہم شادی کرنا نہیں چاہتے البتہ کبھی دل چاہے تو کسی اچھی گانیوالی طوائف سے عقد شرعی کرلیں گے۔ اُن محترمہ نے ہمارے تیور دیکھکر والد سے کہدیا کہ لڑکی کے دادھیالی رشتہ دار مجبور کر رہے ہیں کہ اسکی شادی چچا کے لڑکے سے کیجائے اس لئے میں مجبور ہوں والد قبلہ بھی خاموش

ہو رہے مگر انہیں ایک مستقل خیال ہماری شادی کا پیدا ہو گیا۔ چھ سات
مہینے کے بعد عزیزوں ہی میں ایک بزرگ سے گفتگو شروع کی جو مولوی
عالم اور مولوی فاضل ہونیکے علاوہ نہایت مذہبی اور گزیٹڈ عہدے پر
فائز اور بھاری بھر کم (گراں ڈیل) تھے، یہاں بھی بلا استمزاجِ حقیر گفتگو
شروع ہوئی اور بات پکی ہو گئی۔ ہمیں جب اطلاع ملی تو ہم نے والد کی
ناراضی کے خیال سے خاموشی اختیار کر لی اور ڈیڑھ دو مہینے کے بعد
آہستہ سے اُن بزرگ کے گھر مہمان ہو گئے، وہ اپنے مستقر پر تنہا تھے ہمیں
دیکھکر بہت خوش ہوئے بڑی آؤ بھگت کی نہایت ہی خاطر داری فرمائی
مگر ہم نے دن بھر اُن کے ساتھ گزار کر رات کو انہیں خدا حافظ کہدیا
اور وہیں ایک دوست کے مکان پر جاکر "مجلسِ سرود" منعقد کی دو تین
رنڈیاں بلوالیں رات میں حضرت نے دیر تک انتظار کیا اور ہمیں
ڈھونڈوایا تو پتہ چل گیا کہ ہم گانا سن رہے ہیں، آپ بہت ہی بھنائے
ہم رات بھر کے جاگے ہوئے صبح پہونچکر سو رہے حضرت نے دن بھر گفتگو
نہیں کی، دوسری رات بھی ہم نے ایسی ہی بسر کی اور صبح آکر نہائے
ناشتہ کیا اور اپنا سوٹ کیس کھولکر کپڑے وغیرہ نکال کر اِدہر اُدہر
رکھے دو شیشے ایک "بیر" کا اور ایک "وِہسکی" کا ہم نے سوٹ کیس
میں رکھ چھوڑے تھے۔ ان دونوں کو بھی باہر پھینک دیا۔ اور پڑ کر

سو رہے نہ جانے کسی نے ان سے کہا یا خود انہوں نے دیکھا مگر انہیں
ان دونوں شیشوں کا علم ہو گیا اور ان کے غصے کی انتہا نہیں رہی۔
اسی وقت والد کو تفصیلی خط لکھا جس میں ہماری بڑی تعریف کی تھی
اور یہ بھی کہ آپ کسی اور جگہ انتظام کیجیئے میں ایسے آوارہ لڑکے کو
اپنی لڑکی نہیں دونگا۔

جب ہمیں یقین ہو گیا کہ بزرگوار کو ہماری ان حرکات سے
کمال خوشنودی حاصل ہوئی ہے تو ہم نے دوسرے ہی روز کوچ بول
دیا، وہ شیشے ہم نے سیٹرم اسٹیشن سے آگے بڑھتے ہی پھینک دیئے
اور نہایت متانت سے مستقر پہنچ کر اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے
والد قبلہ نے کئی روز تک گفتگو نہیں کی اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ
ہم نے محض اپنے آپ کو شرابی ظاہر کرنے کیلئے دو شیشے بھی ساتھ رکھکر
ان بزرگ کے گھر پر قیام کیا تھا تو خوب بگڑے مگر کرتے کیا خاموش
ہو رہے اور ہمیشہ کیلئے ہماری شادی کے مسئلہ کو ختم کر دیا۔ چنانچہ
مرنے تک ہماری شادی کی کوشش نہیں کی البتہ انتقال سے چند روز
پہلے نہایت ہی محبت سے ہمیں بلا کر کہا کہ "بیٹا شادی کر لو یہ میری
آخری خواہش ہے کہ تمہیں دولہا بنا دیکھوں۔ اسکے بعد اطمینان سے
مر جاؤں گا۔ ہمنے بکمال سعادت مندی فوراً آمادگی ظاہر کی اور

یہ کہا کہ آپکے صحت یاب ہوتے ہی شادی کی فکر کریں گے مگر اجل نے انہیں مہلت نہیں دی اور ہماری شادی کا ارمان دل ہی دل میں لیئے جاں بحق ہوئے۔ والدِ مرحوم کے وصال کے بعد ہمنے "بین الاقوامی شادی" کی ٹھان لی ان دنوں "انٹرنیشنل میرج" کا خوب چرچا تھا چند مہینے پونے کی سٹرکیں ناپیں۔ مرامٹھہ تعلیم یافتہ خواتین سے راہ و رسم پیدا کئے مگر دو ڈھائی مہینے کے بعد ہی یہ جنون جاتا رہا اور ہمیں کچھ خیال اینگلو انڈین سے عقد شرعی کرنیکا پیدا ہوا بعض تو عیسائی شدہ احباب سے اس کا اظہار کیا تو انہوں نے اس خیال سے باز رکھا اور ہم کورے کے کورے رہ گئے۔

چونکہ ہمنے ایک شاعر کے گھر میں جنم لیا تھا اور ہمارے دادا پر دادا بھی شاعر تھے اسلئے شاعری ہمیں ترکے میں ملی تھی جس کے ساتھ عاشق مزاجی بھی آگئی۔ چنانچہ ہماری عاشق مزاجی میں فرق نہیں آنے پایا، بدنصیبی کہیے یا خوش نصیبی کہ انہیں دنوں میں ایک جگہ دل بستگی ہوگئی مگر چند ہی روز کے بعد افتراق پیدا ہوگیا اور ایک طوطا چشم نے بکمال بے مروتی آنکھیں پھیرلیں۔ اسوقت ہمیں معلوم ہوا کہ عورت کسقدر خود غرض، لالچی اور غیر وفا شعار ہوتی ہے اس کے بعد ہم نے حتمی ارادہ کرلیا کہ نہ تو کسی چونڈے والی سے دل لگائیں گے اور نہ ہی شادی.

کریں گے، اسوقت ہمیں "پنچ متر" کا یہ مقولہ یاد آتا تھا کہ
"عورت ایک سے بات کرتی ہے تو دوسرے کی طرف اضطراب کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور دھیان اس کا تیسرے کی طرف ہوتا ہے"
"ہتھوا پدیش" کے اس خیال سے بھی ہمیں کامل اتفاق تھا کہ
"عورت ہمیشہ بیوفا ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ لوگ کہتے ہیں کہ دیوتاؤں کی استریوں (عورتوں) کا بھی یہی حال ہے اگر کوئی عورت پاک دامن ہے تو اسکی وجہ یہ نہیں کہ وہ عفت مآب ہے بلکہ صرف یہی کہ اس سے کوئی کسی عنایت کا طلبگار نہیں ہوا" تلسی داس کا یہ قول ہمیں یاد آتا تھا کہ
"عورت کے چرتروں کا سمندر ایسا گہرا ہے کہ اسکی تہہ نہیں ملتی"
عورت کے خلاف جتنے مقولے تھے ہم نے سب "منہ زبانی" یاد کرلئے تھے اور ہمیشہ ان کا ورد ہوتا رہتا تھا۔ مگر کب تک زمین نے اپنے محور کے گرد صرف تین گردشیں کی تھیں کہ پھر کسی کے گیسوئے مشکیں نے پھانس لیا اور ع۔

بڑا بول آگے آیا ہم جو بولے تھے لڑکپن میں

اسوقت ہم نے محسوس کرنا شروع کیا کہ عورت "تاج آفرینش" ہے "بہترین اور آخرین تحفۂ آسمانی" ہے "زمین کی فرشتہ خدا کی ذات کی دلرباترین

اور یکتا ترین پرتو ہے" ایک ایسی مخلوق ہی جسمیں لطیف ترین اور صمیم ترین
جذبات ودیعت کئے گئے ہیں اس کا وجود تقدیس اور تعظیم کیلئے ہے
بہرحال اس دلربائی کے راز سربستہ کو جس کا دروازہ مقفل ہے ہمنے بہت
کچھ سمجھ لیا تھا مگر قسمت ــــ موت نے ایک دائمی پردہ حائل کر دیا اور
ہم رو پیٹ کر بیٹھ رہے۔ چار چھ مہینے سوگ منایا۔ اور نہایت خاموش
زندگی بسر کرنی شروع کی چند دنوں عورت کا خیال تک دل میں نہ آتا تھا
مرحومہ کے بعد کوئی ہستی ہی عورت کی پیش نظر نہ تھی۔ مگر آہستہ آہستہ یہ بات
بھی جاتی رہی۔ زندگی میں ایک خلا محسوس ہونے لگا ایک کمی نظر آنے لگی
اور ایک چیز ایسی خیال میں آتی تھی جو موجود نہ تھی، یہ تھی دماغی حالت
مگر ضروریات زندگی نے بھی اس کی تائید شروع کی، بچپن سے ہم
تنہا رہنے کے عادی تھے صرف دو کمرے ہمارے لئے کافی ہوتے تھے
ایک کمرے میں بیٹھتے اٹھتے پڑھتے لکھتے اور دوسرے کمرے میں سوتے
تھے اور اسی کمرے میں سارا سامان رکھا تھا۔ جب تک ہم یونہی زندگی
بسر کرتے رہے مگر بے انتہا تکلیف ہونے لگی۔ دو دو دن کمرا نہیں جھاڑا
جاتا تھا۔ کتابوں پر گرد جمی رہتی تھی۔ جوتے کوئی بھی صاف نہیں کرتا تھا۔
کپڑے بڑی بے احتیاطی سے پڑے خراب ہوتے تھے۔ کھانے پینے کی
تکلیف الگ تھی۔ دوست احباب عزیز و اقارب سبھوں کا یہی مشورہ۔

ہوتا کہ شادی کر لو۔ آخر ہم نے تھک کر اپنی برادری کا جائزہ لیا اور "قرعۂ فال" اِن محترمہ کے نام نکلا جواب ہمارے پلّے مندھی ہوئی ہیں۔

ہم نے خانہ بردوش زندگی اور روز روز کی کوفت سے تنگ آ کر ایک روز اپنی خالہ صاحبہ (جواب خوشدامن ہیں) سے جا کر بکمال سعادت مندی کہا کہ ہمیں اپنی فرزندی میں قبول فرمائیے۔ پہلے تو انہوں نے اُسے دل لگی ہی خیال کیا مگر جب ہم دیر تک یہی الاپتے رہے تو کہا میاں! کسی اور سے کہلوایا ہوتا۔ آخر اتنے عزیز و اقارب ہیں خالہ۔ خالو۔ چچا چچی کسی کو بھی کہتے وہ آکر مانگتے۔ بھلا یہ کیا طریقہ ہے۔ ہم نے کہا جی حضور شادی کریں گے ہم، آپ بیٹی دیں گی ہمیں پھر یہ تیسرے آدمیوں کا توسط کیوں؟ خیر بڑی ردّ و قدح کے بعد یہ طے ہوا کہ ہماری خالہ جان (جو ہماری خوشدامن صاحبہ کی خالہ زاد بہن اور ہماری حقیقی خالہ تھیں) گفتگو کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بات ٹھہر گئی۔ لگیں رسم کی تیاریاں ہونے دو تین وقت منگنی کی تاریخیں مقرر ہو کر بدل گئیں بالآخر منگنی کی رسم ادا ہوئی اور باضابطہ معاملہ طے پا گیا۔

منگنی کے بعد سے ہماری محترمہ ہونے والی بیگم صاحبہ کے مزاج ہی بدل گئے۔ جس دن سے گفتگو ہوئی تھی اُس دن سے وہ ہم سے پردہ کرنے لگیں تھیں منگنی کے بعد سے تو اور "گاڑھا پردہ" ہونے لگا جب کبھی

ہم گھر جاتے وہ کسی کمرے میں جا بیٹھتیں اور اندر سے قفل پڑ جاتا۔ جبتک ہم رہتے قفل نہیں کھلتا، یہ پردہ صرف ہمیں سے نہیں، ہمارے بھائیوں اور عزیزوں سے لیکر ہماری ماماؤں سے تک ہوتا۔ خدا رکھے ہماری بڑی سالی کو بیچاری بڑی سمجھ دار لڑکی ہے۔ اس نے لاکھ سمجھایا منایا، کہ ان خرافات کو چھوڑے مگر "بیوی راضی نہوئیں" نہ صرف انہوں نے پردہ کرنیکی ٹھان لی بلکہ بعض ایسی حرکات بھی سرزد ہونے لگیں جن پر دیوانگی کا شبہ ہوتا تھا۔ خاندان میں چھوٹے چھوٹے بچے بچیاں تھیں، جن بچوں کو ہم کبھی پیار کیا کرتے تھے اُن کو یہ پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتی تھیں اس لئے کہ ہم پیار کرتے ہیں، دیکھئے کس قدر شدید رقابت تھی۔

انہیں معلوم ہوتا کہ ہم دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے ہیں تو کمرے میں گھس کر اندر سے بند کر لیتیں، اگر کوئی ہمارا نام لیتا تو اس سے گفتگو کرنا چھوڑ دیتیں ہم کوئی کتاب بھولتے تو اس کو ہاتھ تک نہیں لگاتیں۔ کسی دن ہم ان کے گھر پر کھا لیتے یا چائے پی لیتے تو وہ اس روز چائے پیتیں نہ کھانا کھاتیں۔

ایک روز انکی بھاوج نے (جو ہماری بھی بھاوج ہیں) ایک رسالہ جسمیں ہمارا ایک ظریفانہ مضمون تھا ورق الٹ کر اور مضمون کی سرخی بتلا کر دیدیا کہ اسے پڑھو بڑا عجیب مضمون ہے۔ بیگم صاحبہ نے مضمون پڑھنا

شروع کیا بہ آواز بلند پڑھکر سبھوں کو لگیں سنانے دو تین ورق پڑھ ڈالے چوتھا ورق جو الٹا تو چند سطریں پڑھنے کے بعد ہمارا نام نظر آیا بس سالہ پھپیاں لگیں رونے اور روتے ہوئے کمرے میں جاکر بیٹھ رہیں اور رات کا کھانا تک نہیں کھایا۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا مگر ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ ہم کو شادی کی آرزو تھی اور اس سے بڑی بڑی توقعات تھیں خصوصاً جب کبھی ہم بیمار ہوتے، شادی نہ کرنے پر افسوس ہوتا۔ جب کبھی وقت پر اچھا کھانا نہ ملتا تو ہم اسے جورو کی غیر موجودگی کا سبب سمجھتے، جب کبھی تھکے ماندے گھر آتے اور کتاب دیکھنے کو دل چاہتا نہ مضمون لکھا جاتا تو ہم آرام کرسی پر لیٹ کر اپنے آپ پر نفرین کرنے لگتے کہ کیوں شادی نہیں کی۔ جب کبھی سکندرآباد جاتے اور واپسی پر حسین ساگر کے کٹّے (بند) پر مخالف ہوا ہماری سائکل کو روکنے لگتی تو اپنی اس حماقت پر بڑی کوفت ہوتی کہ ہم نے کیوں شادی نہیں کی ورنہ جہیز میں کم از کم موٹر سائیکل ضرور ملجاتی جب کبھی کسی شریف آدمی کو اپنی بیوی کو ساتھ لیئے سینما آتے یا جاتے دیکھتے تب بے انتہا کوفت ہوتی کہ کیوں ہم ایسے نہ ہوئے بدنصیبی سے بعض ایسی خواتین سے اور ہم سے خط و کتابت تھی جو ہمیں صرف "مولانا" سمجھے ہوئے تھیں اور کوئی

بڑا ہی سن رسیدہ مجمع معمم، ریشا ئیل، مدرسہ نظامیہ یا دیوبند، یا
سہارنپور کا فارغ التحصیل خیال کرتی تھیں، وہ جب کبھی خط لکھتیں تو
"بیگم تمکین" کو آداب فرمائیے تسلیمات فرمائیے، مزاج پوچھیے خیریت
لکھئے ضرور لکھتیں، ہم بکمال دروغ بافی یا دروغ گوئی یا دروغ
نویسی، بہ اطمینان تمام لکھ دیتے کہ سلام کہتی ہیں۔ آداب عرض کرتی
ہیں، عافیت پرسی کی رہین منت ہیں۔ مہربانی کا شکریہ ادا کرتی ہیں
مگر واقعہ یہ تھا کہ بیگم صاحبہ تھیں ہی نہیں۔ اکثر دوست احباب جو
ذرا کم ملنے والے تھے یہی سمجھتے تھے کہ ہم شادی شدہ ہیں ہماری عافیت
کے ساتھ بیگم صاحبہ کی خیریت بھی پوچھ بیٹھتے اور ہم بکمال تیزی یا
صفائی کہدیتے کہ اچھی ہیں۔ ایک رسالہ کی مدیرہ نے بڑی متانت
سے بیگم تمکین کے نام پہلے تو رسالہ روانہ فرمانا شروع کیا دو چار پرچے
بھیج کر آپ نے ایک خط لکھا کہ "محترمہ مضمون روانہ فرمائیے" ہم نے
بھی ایک عدد مضمون اپنی فرضی محترمہ کے نام سے بھیج دیا اور مدت
تک بھیجتے رہے۔ نظام ساگر کنال پر ایک مہاراج جو سررشتہ
تعمیرات میں ملازم اور لاہور کے باشندے تھے تشریف رکھتے تھے
اسی رسالے میں آپ نے بھی فرضی عورت کے نام سے مضمون نگاری
شروع کی، اور اسی سلسلہ میں بیگم تمکین سے خط و کتابت شروع ہوئی

ایک ہندو دیوی کے خطوط محترمہ کے نام بڑے ہی محبت بھرے وصول
ہونے لگے ہم پہلے ہی سے سمجھے ہوئے تھے کہ کیا معاملہ ہے بعد میں
جو دریافت کیا تو پتہ چلا کہ راجہ جی یہ یک بینی و دوگوش تنِ تنہا واقع
ہوئے ہیں اور فرضی نام سے مضمون لکھتے اور خط و کتابت کرتے ہیں
چنانچہ ہم نے ایک دفعہ بیگم صاحبہ بن کر لکھ مارا کہ "بہن میں اپنے شوہر
کے ہمراہ نظام ساگر دیکھنے آ رہی ہوں اور آپ کی مہماں ہوں گی
آپ میری رہائش کا انتظام کر سکیں گی یا کیا؟
مہاراج نے خط لیکر پڑھا اور پھر پھٹے ہوئے لفافے کو جوڑ کر
پوسٹ من سے اس پر یہ لکھوا کر کہ "مکتوب الیہ نہیں ہیں" واپس کرا دیا
اور اس دن سے آجتک کبھی بیگم تمکین کو خط نہیں لکھا ہم نے جب
اس واقعہ کو شہرت دی اور ان کے آفیسرز کو یہ راز معلوم ہو گیا اور
ایک بزرگ ان کے سخت مخالف ہو گئے تو انہوں نے کوشش کر کے
آرائش بلدہ میں منتقلی کرالی نہ جانے اب کہاں ہیں۔ ایک دفعہ
ہم سفر کر رہے تھے داڑھی جنکشن پر "زنانہ سیکنڈ کلاس" کے ڈبے میں
ایک بھورے بھورے بالوں والا، پھولے پھولے گالوں والا، بھرے
بھرے جسم کا چھوٹا سا لڑکا نظر آیا ہم نے کھڑکی کے پاس پہونچکر
اسے بلایا تو آ گیا، گود میں اٹھا کر لگے پلیٹ فارم پر ٹہلنے، چونکہ بچہ اچھا

؎ حیات نو کے ایڈیٹر نمبر ۱۱ میں دیوی صاحبہ کی تصویر بھی شائع ہوئی ہے

اور صحت مند تھا اس لئے ہر شخص اسے دیکھتا اور پوچھتا "کیا آپکے صاحبزادے ہیں" اور ہم ذرا شرما کر ہنس دیتے ہم نے تو "جواب جاہلاں" سمجھ کر خاموشی اختیار کی تھی مگر ان جاہلوں نے نیم رضامندی یا "اعترافِ پدریت" سمجھکر اس پرائے بچے کو ہمارا قرار دے لیا پھر کیا تھا جو شخص بھی ملتا کہتا "اچھا آپ معہ زنانہ سفر کر رہے ہیں" کوئی کہتا "اماں امدت کے بعد تم زنانہ مستقر پر لئے جا رہے ہو۔ اچھا بھئی یہ حیدر آباد کی آب وہوا خراب بھی تو ہے" کوئی کہتا "بھائی گرمی کے دنوں میں زنانہ کیوں لے جا رہے ہو گلبرگہ میں شدید گرمی ہوتی ہے گرمی کے بعد لیجاتے" جتنے منہ اتنی باتیں ہم سنتے اور خاموش رہجاتے ایک کرم فرمانے جو "ہنواں" کے رہنے والے تھے بچے کو دیکھا تو زنانے کے ساتھ ہونے کا یقین کرتے ہوئے کہا "یار پان کھلوادو" ہم نے جیب سے ڈبیہ نکال کر تواضع کرنی چاہی مگر وہ اڑے رہے کہ نہیں "بھاوج کے ہاتھ کا لگا ہوا تازہ پان ہو" ہمیں بھی شرارت سوجھی دوڑ کر تھوڑا سا میوہ خریدا پیپرمنٹ اور مٹھائی بھی لی اور بچے کو ریل کے ڈبے میں پہونچا کر پیار کرتے ہوئے کہا میاں دو پان تو بنوا دو، اندر سے تھوڑی دیر کے بعد ایک کالی کلوٹی آیا نے ایک نہایت نفیس چاندی کی نقشی ڈبیا بڑھادی جس میں چار پان دو

تھے اور دو چونے کے الگ الگ لگے ہوئے تھے ہمارے مہربان بہت بگڑے کہ یارسو کھے کتھے کے پان کون کھائے۔ ہم نے کہا بھیّا! تمہاری سمجھ اوج ٹھیٹھ دکنی ہیں وہ پان میں پکا ہوا کتھا نہیں کھاتیں پھر تمہیں کہاں سے لادیں چونکہ پان چکنے اور خوبصورت بیڑے بنے ہوئے تھے اس واسطے حضرت کھا گئے ہمنے کہا چلو رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔ اسی طرح اکثر احباب کو ہمارے شادی شدہ ہونیکا یقین تھا۔ مگر جب کبھی وہ لوگ اپنے ایقان کا اظہار کرتے ہمیں سخت تکلیف ہوتی اور نہایت حسرت سے دل ہی دل میں کہتے کہ کاش ایسا ہوتا۔

اسی کوفت کو مٹانے کیلئے ہم نے شادی کی ٹھان لی اور منگنی بھی ہوگئی مگر واقعات کچھ ایسے پیش آتے رہے کہ شادی بڑھنے لگی کبھی ربیع الاوّل میں کبھی ذالحجہ میں بہرحال ایک مدت تک یہی

حرف خطاب حسینذ رشید کافی ہیں تھے
شلغم الدولہ حضرت برقی نے لکھا ہے

---- * ----

خان صاحب

لوگ کسی خبیث بوڑھے کو دیکھتے ہیں کہ "اسے رزق ہے نہ موت،"
بالکل یہی حال ہمارے خانصاحب کا ہے۔ ساٹھ سال کی عمر کمر جھک گئی ہے
پیٹ اکڑ گئی ہے۔ جوڑ جوڑ میں درد ہے بال پک گئے ہیں چہرے پر
جھریاں آگئی ہیں۔ گال پچک گئے ہیں۔ دانت گرے مدت ہوئی دو
چار چوگڑے (مصنوعی دانت) بدل چکے ہیں، مگر ہیں بزعم خود جوان
دو شادیاں کیں اور دو ہی نکاح کئے۔ ان چاروں نیک بختوں کو
قبرستان پہونچا دیا۔ عزیز، قرابت دار، خویش و اقارب کوئی باقی
نہیں رہا اپنے خاندان میں فقط آپ ہی آپ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہو کر
رہ گئے چنانچہ اسی لئے یہ مصرعہ ہمیشہ تلاوت فرمایا کرتے ہیں ؏

"ایک میں ہوں یا خدا کی ذات ہے"

مشہور ہے کہ خانصاحب نے مدتوں شاعری کی خصوصاً ایک واقعہ

بہت مشہور ہے یہ کہ ایک دفعہ خانصاحب نواب جعفر علی خاں بہادر کے پاس پہنچے۔ نواب صاحب آپکی بہت قدر کرتے تھے۔ دس بجے سے بارہ بجے تک بیٹھے رہے۔ بارہ بجے نواب صاحب کا خاصا چنا گیا محل سے چوبدار نے آکر اطلاع دی کہ حضور خاصہ تیار ہے نواب صاحب نے خانصاحب کو رخصت فرمایا خود محل کیطرف تشریف لے چلے ابھی زنانی دروازے تک پہونچے بھی نہ تھے کہ خانصاحب نے بڑھ کر عرض کیا حضور سے کچھ عرض کرنا تھا۔ نواب صاحب ٹھہر گئے فرمایا کہو عرض کیا حضور تشریف رکھیں تو عرض کروں نواب صاحب پھر واپس ہوئے آکر اپنی جگہ بیٹھ گئے خانصاحب نے عرض کیا حضور خانہ زادِ موروثی نے ایک شعر عرض کیا ہے بالکل نئی بندش، نیا مضمون اور نئی زمین ہے، نواب صاحب کا اشتیاق اور بڑھا فرمایا سناؤ پھر تو خانصاحب نے تعریف کے پل باندھ دیئے کہنا شروع کیا " خداوند یہ جو دہلی کے داغ صاحب ہیں اور یہ جو امیر مینائی مشہور ہیں۔ بھلا شعر کیا جانیں۔ علوی اور میکش کو شاعری سے تعلق کیا ہے۔ شعر کہنا تو کچھ خانہ زادوں ہی کا کام ہے۔ ملاحظہ ہو کیا شعر عرض کیا ہے۔ ابھی خانصاحب کی بکواس جاری ہی تھی کہ اندر سے ایک ماما نے آکر عرض کیا کہ سرکار خاصہ تیار ہے مگر نواب صاحب

ہوں۔ کہکر پھر خانصاحب کی طرف متوجہ ہوگئے اور خانصاحب نے
پھر وہی تعریف شروع کی ایک بج گیا۔ مگر تعریف ختم نہیں ہوتی ڈیڑھ
بجے نواب صاحب نے شدت اشتہا سے بے چین ہو کر فرمایا اجی خانصاحب
شعر سنا دیجئے مجھے اندر جانا ہے۔ بس پھر کیا تھا خانصاحب دو زانو
ہو کر بیٹھ گئے عباسی کو بازو سے لیکر سامنے رکھ لیا دستار سیدھی کی کمر کا
پٹکو س برابر کیا۔ انگرکھے کی جھریاں درست کیں اور کھنکار کر حلق صاف
کیا تنتے ہوئے مسکرا کر کہا حضور ایسا شعر کوئی کہہ لے تو میں جانوں
میرا دعوےٰ ہے کہ داغ، امیر، منیر، علوی، بیکش، سے لیکر برتر یا زغ
ناظم، کیفی، تجلّی، مست، رسوا، حبیب، ضیغم، کوئی تو ایسا ایک مصرعہ
کہہ لے۔ اسی گفتگو میں دو بج گئے اور مارے بھوک کے نواب صاحب کا
بُرا حال ہوگیا۔ نواب صاحب نے بے چین ہو کر فرمایا اجی خانصاحب
شعر ایسا ہی ہوگا مگر سنائیے تو، پھر خانصاحب نے گلا صاف کیا
اور گنگنا کر حافظہ پر بار ڈالا مگر کچھ نہیں ادہر نواب صاحب متقاضی
کہ جلد شعر سنائیے ادہر خانصاحب متلاشی کے شعر یاد آجائے۔ انتہا
یہ کہ ڈھائی بج گئے اور خانصاحب کو شعر یاد نہ آیا۔ مجبوراً عرض کیا
حضور اسوقت حافظہ سے اتر گیا ہے۔ کل انشاء اللہ عرض کروں گا
نواب صاحب کا بھوک کے مارے بُرا حال تھا، مگر خاموش ہو رہے۔

مسکراتے ہوئے محل میں تشریف لے گئے۔

خانصاحب کا دیوان بھی مشہور ہے ایک بزرگ فرماتے تھے کہ خانصاحب نے ایک دفعہ ایک بڑے شاعر کو گانٹھا اور گھر لیجا کر لگے گپ کرنے انہوں نے شعر سنانے کی فرمایش کی تو آپ نے اندر سے ایک قلمدان منگوایا اسے کھولکر ایک چھینٹ کا بستہ نکالا جسے کھولا تو ایک بھرے کا جزو دان نکلا اسمیں سے ایک مخمل کا جزو دان برآمد ہوا اور مخمل کے جزدان میں سے ایک باریک ریشم کا جزو دان نکالا گیا جس میں ایک چھوٹی سی بیاض مطلا مذہب جلد کی نکلی خانصاحب نے پہلے تو بہت کچھ انکسار فرمایا اور پھر شعر سنایا۔

جو سڑک جاتی ہے مدینے کو

سننے والا منتظر کہ دوسرا مصرعہ بھی سن لے تو داد دے اور خانصاحب بیچین کہ داد مل جائے تو دوسرا شعر سناؤں آخر مہمان نے اکتا کر کہا خانصاحب مصرع ثانی ارشاد ہو۔ بس خانصاحب کے آگ لگ گئی فرمانے لگے یار تمہیں شاعر کس مردود نے بنا ڈالا تم تو حجام ہو میں پورا شعر سنا رہا ہوں اور آپ مصرع ثانی کی فرمایش کرتے ہیں جنگلی کہینگے! غصہ میں آکر اپنی بیاض کو پھر جزدان در جزودان کر کے قلمدان میں رکھدیا اور خود دیوانخانے سے

چلے گئے۔ سنا ہے کہ پھر کبھی اُن صاحب سے ملاقات نہیں کی اور نہ انکو شاعر کہا۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ وہ تو جنگلی ہے جنگلی۔

مشہور ہے کہ خانصاحب جوانی میں بہت تنتنے پھرتے تھے۔ روزانہ پانچ بجے ہتیار لگا کر بانکے جواں بن کر گھوڑے پر سوار ہو کر چارمینار کا ایک چکر ضرور کاٹتے، ایکدفعہ خانصاحب شربتی ململ کا انگرکھا اونچی چولی والا پہنے ناندیڑی کلی کا سیلا باندھے کمر میں کٹار لگائے ڈاب میں عباسی ڈالے ایک مشکی گھوڑے پر سوار گھوڑا اڑاتے ہوئے چارمینار کے پاس پہنچے اس زمانے میں چارمینار کے اطراف کے بنگلو (کوٹھوں) میں زنڈیاں تھیں، ایک بی جان کھڑی ہوئی سڑک کا نظارہ کر رہی تھیں کہ خانصاحب کا گھوڑا انکے کوٹھے کے نیچے پہنچا بی جان نے جھک کر بندگی کی خانصاحب نے سلام لینے کیلئے ہاتھ اٹھایا تو لگام ڈھیلی ہوئی اور گھوڑے نے ٹھوکر لی خانصاحب نے باگیں کھینچ کر گھوڑے کو رانوں میں مسلا اور کوڑا کیا اس گڑبڑ میں گھوڑے سے ریح صادر ہوگئی۔ آواز سنکر بی جان لگیں مسکرانے خانصاحب نے مونچھیں چڑھاتے ہوئے فرمایا "مردانِ عالم جس پر سواری کرتے ہیں اُسے پدا دیتے ہیں" بی جان نے مسکرا کر ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور گھر والی بدمن ہوگئی ہوگی" شہر کے بیکار دل کا تو یہ اڈا ہی تھا

سینکڑوں بانکے نوجوان کوٹھوں کے نیچے کھڑے تھے۔ انہوں نے یہ فقرہ سنا تو لوٹ گئے وہ وہ پھبتیاں اڑائیں کہ خانصاحب بوکھلا گئے اور گھوڑا پلٹا کر گھر کا رُخ کیا اُسدن سے آجتک پھر چارمینار کیطرف نہیں گئے منصب کے علاوہ خانصاحب کی جاگیر بھی تھی اور دو ایک چھوٹے چھوٹے مقطع (موضع) بھی تھے تنہائی سے اکتا کر خانصاحب نے شادی کی فکر کی تو بعض حریصوں نے یہ سمجھ کر کہ بوڑھا آجکل میں مرنے والا ہے اپنی نوجوان لڑکیوں کو دولت کی بھینٹ چڑھانا چاہا چنانچہ ایک نوجوان لڑکی سے خانصاحب کی شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی اس تقریب میں لوگوں نے سہرے قصیدے، قطعات اور رباعیات اتنے لکھے کہ اگر ان کا مجموعہ شائع کیا جائے تو ایک خاصی کتاب یا شادی نمبر ہو جائیگا۔ چنانچہ ایک صاحب نے ایک قطعہ لکھتے ہوئے یہ مصرعہ بھی لکھدیا۔ ع۔

۱۴۰ صدوسی سال کا نر پانچ برس کی مادہ

خانصاحب کی دوسری جمعگی کے روز ایک صاحب نے ایک طویل نظم پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا۔

ستم ہے ایسی نوجہ پر تاسف ایسے شوہر پر
یہ آمادہ ہی مدت سے تو وہ بیکار بیٹھی ہیں

بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں ہوئیں مگر واقعہ یہ ہے کہ شادی سے

پہلے خانصاحب نے مراد آباد کی مردہ زندہ کرنیوالی دوا سے لیکر دوائے شاہ جہانی اور واجد علیشاہی تک منگوالیا تھا اور آنتک نگرہ گولیوں سے لیکر حکیم اجمل خانصاحب کے دواخانہ یونانی دہلی سے کشتۂ فولاد تک طلب کر لیا شہر کے سارے طبیبوں، عطائیوں، اناڑیوں، ڈاکٹروں حکیموں ویدوں سبھی سے نسخے لکھائے مغز سر کنجشک خانگی، کا حلوا تیار ہوا اور نسخۂ شاہجہانی کے طریقے پر "حلوۂ گذر" بنایا گیا" سانڈے کا تیل اور اجمل خانصاحب کی تکمید، تدبیرِ اعلیٰ سبھی چیزیں استعمال کی گئیں مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کا مصداق رہا خانصاحب پر کوئی بھی اثر نہ ہوا مشہور ہے کہ جلوے کی رات خانصاحب نے بڑی بے اطمینانی سے بسر کی اور فجر کی نماز بھی ادا کی جس کے لئے صرف وضو کرنے کی ضرورت پڑی غسل واجب ہی نہیں ہوا اس واقعہ کو سنکر ایک صاحب نے

شب زفاف و نماز سحر یہ خوب کہی

ایک غزل کی غزل کہدی۔

بیچاری دلہن اپنے جذبات کو روکتی رہی مگر کب تک آخر دق کا شکار ہو گئی۔ ایک سرخ و سفید رنگت والی۔ پھولے پھولے گالوں والی

کالے کالے بالوں والی بھرے بھرے جسم والی سیزدہ سالہ نوجوان لڑکی کھل کھل کر جو ابھی چالوں ہی میں آدھی رہ گئی پانچویں چھمگی سے جو فرائش ہوئی تو بس ہی بارہ مہینے میں ختم ہوگئی۔

مشہور ہے کہ خانصاحب نے شادی تو کرلی مگر انکی جان ضیق میں پڑگئی تھی۔ رات یونہی انہیں نیند نہ آتی اگر وہ سو بھی جاتے تو دلہن جگا دیتی اس سے نجات پانے کے لئے خانصاحب نے علحدہ علیحدہ پلنگڑیاں (چارپائیاں) ڈلوادی تھیں اور ایک کمال یہ کرتے کہ دن بھر ہنسی خوشی رہتے مگر مغرب ہوتے ہی منہ پھلا لیتے اور رات کا کھانا کھاتے وقت کوئی نہ کوئی جھیڑ نکال کر بگڑ جاتے اور غصہ غصہ میں منہ لپیٹ کر پڑ رہتے اگر اس کے باوجود بھی وہ غریب کسی نہ کسی طرح انہیں جگا دیتی تو کراہنے لگتے کبھی ڈاڑھ میں درد بتلا کر اسے پانی گرم کرانے کیلئے کہتے اور کبھی سر میں درد ظاہر کرکے اس غریب سے صندل گھسواتے آخر بیچاری کو مار کر دم لیا۔ فقط